انتخاب
کلامِ ظفر

مرتبہ
شاہد علی خاں

آئینہ ادب - چوک انار کلی ۰ لاہور

متحدہ ہندوستان

کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر اقلیم سخن کے بھی تاجدار تھے - انکا کلام روزمرہ کی صفائی، محاورہ کی گھلاوٹ، زبان کی شیرینی اور بیان کی دلکشی کے اعتبار سے اردو ادب میں منفرد حیثیت رکھتا ہے لیکن دقت یہ تھی کہ زمانہ کی موجودہ تیز رفتاری شائقین ادب کو انکے ضخیم کلیات کے مطالعہ کی مہلت نہ دیتی تھی - اب جناب شاہد علی خاں صاحب کی محنت نے یہ مشکل بھی آسان کر دی -

انتخاب کلام ظفر میں ظفر کی سخن گوئی کے تمام امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے اشعار کی گویا روح کھینچ لی گئی ہے -

م، ع سلام

سرورق : سلامی

۲/۴

انتخاب

کلامِ ظفرؔ

مرتبہ

شاہد علی خاں

ناشران

آئینۂ ادب • چوک مینار انارکلی • لاہور

اہتمام
م، ع، سلام
شیخ عبدالسلام اینڈ سنز
چوک مینار انارکلی
لاہور

قیمت: دو روپے ۸ر

نقوش پریس لاہور میں طبع ہوا

مُقدمہ

سوچا تو یہی تھا کہ کلامِ ظفر کا انتخاب مکمل ہوتے ہی سب سے پہلے ظفر کے حالات لکھوں گا۔ پھر ان کے کلام پر جو عوام اور تنقید نگاروں کی توجّہ کا آج بھی محتاج ہے، اپنی استعداد کے مطابق کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن انتخاب مکمل کرنے کے بعد جو سر اُٹھایا تو جس اخبار اور رسالے پر نظر پڑتی اس میں بہادر شاہ ظفر کے حالاتِ زندگی ہی نہیں بلکہ اس دور کی تاریخ بکھری پڑی تھی۔ لہٰذا حالاتِ زندگی لکھنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

اِن اخبارات اور رسائل نے ظفر کی زندگی اور اس دور کے تاریک سے تاریک تر پہلو پر بڑی گہری روشنی ڈالی۔ لکھنے والوں نے اس دور کی تاریخ دُہرا دی لیکن کسی نے بھی ظفر کے کلام پر سیر حاصل بحث نہیں کی۔ اسے ظفر کی بدقسمتی ہی کہئے کہ آج تک سوائے نیاز فتحپوری، شان الحق حقّی اور خلیل الرحمان کے کسی نے بھی ظفر کے کلام پر خلوصِ دل سے تنقید نہیں کی اگر کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو اُسے تنقید نہیں کہا جا سکتا، ہاں تبصرہ کہہ لیجئے۔

اب بات نکلی ہے تو کیوں نہ ان بزرگ (مولانا محمد حسین آزاد) کا ذکر بھی کر دیا جائے جنھوں نے اُردو ادب کی تاریخ مرتّب کر کے ادب میں اپنا تو ایک مقام بنا لیا لیکن ظفر غریب

کے ساتھ ایسی نا انصافی کی جسے ظفرؔ کی روح ہی نہیں بلکہ ان سے عقیدت رکھنے والے بھی کبھی معاف نہ کریں گے ——— ویسے تو ایک عرصہ سے مولانا آزاد کو ان کی اس نا انصافی کے سلسلے میں کافی مطعون کیا جا رہا ہے، لیکن یہاں ان کے ذکر کا مقصد صرف ظفرؔ کے ماتھے پر لگے ہوئے کلنک کو صاف کرنا ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو ایک نصیحت کرنا بھی ہے۔ اور وہ نصیحت یہ ہے کہ ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لینے والے کو استادوں سے اندھی عقیدت، دوست نوازی یا بے جا طرف داری سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ یہ ادب نوازی نہیں، ادب دشمنی ہے۔ ویسے بھی جھوٹ کو قیام کہاں، یہ متجسس نگاہیں وقت نکل جانے کے بعد، اور زندہ ثبوت نہ ہونے کے باوجود بھی اصلیت کو پا لیتی ہیں۔ اور اس کا ثبوت بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری ہے۔ آج مولانا محمد حسین آزاد کی اس لغزش نے ان کے مرتبہ کو جو صدمہ پہنچایا، اس کا اندازہ اگر وہ زندہ ہوتے تو خود ہی کر سکتے تھے۔

مولانا آزاد نے بھی تو غضب کیا بچارے ظفرؔ کی ساری عمر کی کمائی شاہ نصیرؔ اور اُستاد ذوقؔ کی جھولی میں ڈال دی۔ کہتے ہیں ——— "بادشاہ کے چار دیوان تھے، پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیرؔ کی اصلاحی تھیں، کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم (ذوقؔ) کے ہیں" اب بھلا سوچیئے۔ ستّر برس کا سخن فہم، موزوں طبع، شعر و سخن کا شیدائی اور پھر جس کا اُستاد بھی استادِ وقت ہو، جس کا اپنا ایک لمبہ ماحول، المیہ گزار ہو، جو اپنے سینے میں حساس دل رکھتا ہو کیا زندگی بھر ایک شعر بھی گھڑنے کے لائق نہیں بن سکتا۔ اگر اسے سچ مان بھی لیا جائے تو اس میں ظفرؔ کا کیا قصور، اس ماحول کا ہے جس میں حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ، میر قمرالدین منتؔ اور میر نظام الدین

ممنون جیسے بلند پایہ شاعر موجود تھے۔ اور جن کی موجودگی ہی میں شعر و شاعری کی محفلیں جمتی تھیں، ادبی معرکے ہُوا کرتے تھے۔ نت نئے الفاظ جنم پاتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو ایک ادبی ماحول کے لئے ضروری ہے۔

بات بڑھانے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اگر مولانا آزاد کی رائے کو جو انھوں نے ظفر کے سلسلے میں دی ہے بغور مطالعہ کیا جائے تو انہیں کے الفاظ سے ان پر شبہ پڑتی ہے ایک جگہ وہ ظفر اور ذوق کی شاعری کو جُدا جُدا بتاتے ہیں اور دوسری جگہ ظفر کے سارے کلام کو ذوق کا کلام ثابت کرتے ہیں جو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ان کا یہ ذہنی انتشار صرف ذوق کے دیوان میں اضافہ کرنے اور "ملک الشعرائی کا تاج" رکھنے کی وجہ سے تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو ثبوت انہوں نے ذوق کی عظمت بڑھانے کے خیال سے پیش کئے ہیں ان سے ان کی عزت بڑھتی نہیں اور گھٹتی ہے۔ اس لئے کہ جہاں کلیاتِ ظفر میں اچھی اچھی غزلیں، نظمیں، رباعی، قطعے وغیرہ ہیں وہاں گھاس پھوس کی بھی کمی نہیں۔ ایسی چیزوں کو ذوق جیسے عظیم المرتبت شاعر سے منسوب کرنا ایک ایسی غلطی ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو بھی چھوڑیئے، ظفر نے اپنے دیوان سوم اور چہارم میں ذوق کو یاد کیا ہے۔ دیوانِ سوم کے بارے میں تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا، البتہ دیوان چہارم تو یقیناً ذوق کے بعد کا ہے کیا وہ اشعار بھی جو دیوانِ چہارم میں ہیں ذوق ہی نے ظفر کو لکھ کر دے دیئے تھے؟

تیرا انداز شعر ظفر جانتا ہے کون! استاد ذوق تھا ترا واقف مذاق سے
گیا لطفِ سخن تو ذوق ہی کے ساتھ دنیا سے جو تھوڑا سا رہا ہے اے ظفر کچھ تو نہیں کا ہے

یہی نہیں بلکہ ذوق کے مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے۔ ظفر ہی کا کہا ہُوا ہے۔ لوح

مزار بھی انھوں نے خود لکھ کر دی تھی۔ اچھا اسے ابھی چھوڑیئے۔ ذوق اور ظفر کی شاعری کو لیجیے۔ ذوق کا کلام فنی اعتبار سے ظفر سے کہیں بلند ہے۔ ذوق کے یہاں عالمانہ وسیع النظری، ندرت آفرینی اور خیالات میں پختگی پائی جاتی ہے، جبکہ ظفر نے عام طور پر سطحی مضمون نظم کیے ہیں۔ ذوق مصائب و آلام سے گھبرا کر بری طرح رونا شروع نہیں کرتے، اور نہ ہی کسی کو رلانے کی کوشش کرتے ہیں، البتہ ان مصائب کی طرف اشارہ کر کے دوسروں کی ہمدردی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔

شمع ہے اک سوزِ گم گشتہ اس کاشانے میں ۔۔۔ دردِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانے میں

نغمہ ہائے دل کو بھی اے دل غنیمت جانئے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اس کے برخلاف جبکہ ظفر کی شاعری کی بنیاد شگفتہ شاعری پر رکھی گئی تھی۔ وہ اکثر بیشتر روتے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔ اور بعض جگہ تو ان کو روتا دیکھ کر دل بھی رونے لگتا ہے۔

رات ہمسایوں نے اُٹھ اُٹھ کے دعائیں مانگیں

سوزِ نالہ میرا مدھم نہ ہوا پر نہ ہوا

سُن کے نالہ اور جوشِ گریہ میرا دیکھ کر

آسماں پہ ابر کڑکا اور کڑک کر رہ گیا!

دوسری سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ظفر کے یہاں تاج و تخت، جاہ و حشم سے متعلق بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ یہ اشعار انھیں سے متعلق ہیں اور انھیں کے کہے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے اشعار نہ تو شاہ نصیر کے یہاں ہیں نہ ذوق کے

یہاں - اور نہ ہی اس دَور کے کسی اَور شاعر کے یہاں -

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

خواب تھی جو زندگی جاہ وحشم میں کٹ گئی
ورنہ اپنی عمر ساری درد وغم میں کٹ گئی

ذوق کی شاعری خارجی شاعری ہے اَور ظفرؔ کی خالص واردات - ذوق نے زندگی کے اہم مسائل کا کافی مطالعہ کیا ہے اُور اس کی گہرائی تک پہنچ گئے - لیکن ظفر نے سرے سے ہی اس طرف توجہ نہیں دی - ہاں ظفرؔ نے اپنی شاعری میں جو تیور استعمال کئے ہیں وُہ ذوق کے یہاں نہیں ملتے -

خدا جانے حلاوت کیا تھی اب تیغِ قاتل میں
لب ہر زخم ہے گویا آہا ہا ہا! آہا ہا ہا

کیا رنگ ڈھانی ہے یہ چشم تر ادہو ہو
خونِ جگر آہا ہا ، لختِ جگر ادہو ہو

ذوق اور ظفرؔ کی شاعری کے سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ میرے ایک دوست نے مجھے سُنایا - یہ لطیفہ اس بحث کا بہترین حل ہے - اس کے بعد کسی قسم کی بحث کی ضرورت ہی نہیں رہتی - اب لطیفہ سُنئے - ایک دفعہ سرسید احمد خاں ، مولانا حالؔی ، مولانا شبلی ، وغیرہ ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ غالباً مولانا شبلی نے کہا "معلوم یہی ہوتا ہے کہ ظفر کو ذوقؔ ہی شعر کہہ کر دیتے تھے" سرسید احمد خاں نے اتنا سُنتے ہی نوالہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور بولے "میاں وہ کیا لکھ کر دے گا - اس نے تو خود بھی اپنی زبان قلعہ معلیٰ میں درست کی ہے"

ظفرؔ نے بے شمار غزلیں کہی ہیں - اس کے علاوہ ترجیع بند ، مخمّس ، مسدس ، قطعات

نعتیں، رباعیات، سہرے اور پنکھے وغیرہ بھی کلیات میں ملتے ہیں ظفرؔ بے لطف قافیوں خشک ردیفوں، سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ تھے۔ شعر عام فہم اور سلیس زبان میں کہتے تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں جرأت کی جھلک ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار بھی بے شمار ہیں، روزمرہ، محاورہ بندی، رعایت لفظی، محاکات اور سراپا نگاری ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کا بیشتر کلام عام واردات اور عشق و محبت سے پُر ہے۔

ظفرؔ یاسیات کے امام تو نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن یاسیات میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ظفرؔ کا وہ کلام جس میں ان کا غم پوری طرح نمایاں ہے بلاشبہ ذوق کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس انتخاب میں دیوان اوّل سے پہلے جو اشعار اور غزلیں دی گئی ہیں ان کے متعلق یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ظفرؔ ہی کی ہیں اور غدر کے بعد کی ہیں، لیکن مشہور یہی ہے، ویسے ان غزلوں میں ظفرؔ کا مخصوص رنگ بھی ملتا ہے۔

اس انتخاب کے سلسلے میں جو کتابیں زیر مطالعہ رہیں ان کے نام یہ ہیں۔

انتخاب ظفرؔ، مرتبہ شان الحق حقی۔

بہادر شاہ ظفرؔ، از امیر احمد علوی

اور فکر و فن، (مضمون بہادر شاہ ظفرؔ) از خلیل الرحمٰن اعظمی۔ میں ان کے مصنف اور مرتب کا ممنون ہوں۔

شاہد علی خاں

نہ دبایا زیر زمیں انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشان مزار ہے

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بُجھا دیا

مجھے دفن کرنا تو جس گھڑی، تو یہ اُس سے کہنا کہ اے پری
وُہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، تہِ خاک اُس کو دبا دیا

دمِ غسل سے مرے پیشتر اسے ہمدموں نے یہ سوچ کر
کہیں جائے اس کا نہ دل دہل، مری لاش پر سے ہٹا دیا

میری آنکھ جھپکی تھی ایک پل، مرے دل نے چاہا کہ اُٹھ کے چل
دلِ بیقرار نے او میاں! وہیں چُٹکی لے کے جگا دیا

میں نے دل دیا، میں نے جان دی، مگر آہ تو نے نہ قدر کی!
کسی بات کو جو کبھی کہا، اسے چُٹکیوں سے اڑا دیا

نہیں حالِ دہلی سنانے کے قابل
یہ قصّہ ہے رونے رُلانے کے قابل
اُجاڑے لُٹیروں نے وہ قصر اس کے
جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفرؔ ہے
فقط حالِ دہلی سُنانے کے قابل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مُشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بےکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا مجھے سُن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا جو اُن پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سُنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
وے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں ان کے بخار ہے
نہ تھا شہر دہلی، یہ تھا اک چمن، کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے، یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی، جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے
شب و روز پھول میں جو تُلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انھیں کہا گُل کے بدلے یہ ہار ہے
سبھی جا وہ ماتمِ سخت ہے کہو کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وُہ تاج ہے نہ وُہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور سے، وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ اُن کے نہ تار ہے
نہ دبال تن پہ ہے سر مرا، نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا، مجھے اپنی زندگی بار ہے
کیا ہے غم ظفرؔ تجھے حشر کا، جو خدا نے چاہا تو بر ملا
ہمیں ہے وسیلہ رسول کا، وہ ہمارا حامیٔ کار ہے

یار تھا، گلزار تھا، مے تھی، فضا تھی، میں نہ تھا
لائقِ پا بوسِ جاناں، کیا حنا تھی، میں نہ تھا

ہاتھ کیوں باندھے مرے، چھلّا اگر چوری گیا
یہ سراپا شوخیٔ دُزدِ حنا تھی، میں نہ تھا

بے خودی میں لے لیا بوسہ، خطا کیجئے معاف
یہ دلِ بے تاب کی ساری خطا تھی، میں نہ تھا

ہائے ساقی! یہ ہو ساماں اور عاشق واں نہ ہو
یار تھا، سبزہ تھا، بدلی تھی، ہوا تھی، میں نہ تھا

میں سِسکتا رہ گیا اور مر گئے فرہاد و قیس
کیا انھیں دونوں کے حصے میں قضا تھی، میں نہ تھا

میں نے پوچھا کیا ہوا وہ آپ کا حُسن و شباب
ہنس کے بولا وُہ صنم، شانِ خدا تھی، میں نہ تھا

اے ظفر یہ دل پہ میرے داغ کیسا رہ گیا
خانہ باغِ یار میں خلقِ خُدا تھی، میں نہ تھا

بہار آئی ہے، بھر دے بادۂ گُل گوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ

اسی رشکِ پری پہ جان دیتا ہوں میں دیوانہ
ادا جس کی ہے بانکی، ترچھی چتون، چال مستانہ

نبھے کیوں کر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ
وہ بے پروا میں سودائی، وہ سنگیں دل، میں دیوانہ

مجھے آنا ملے کیوں کر تری محفل میں جانانہ
مری صورت فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

غزالِ دشت بولے دیکھ کر مجنوں کی میت کو
یہ وحشی مر گیا بس ہو چکا آباد ویرانہ

ہمارے اور تمہارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں
کوئی سُنتا نہیں اب لیلےٰ و مجنوں کا افسانہ

گزر یارب، گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں، نالۂ بلبل ہے مستانہ

ظفرؔ وہ زاہدِ بے درد کی "ہو حق" سے بہتر ہے
کرے گر رندِ دردِ دل سے ہائے، ہوئے مستانہ

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مرے پاس آتے تھے دم بدم وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم کہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے

جو ملاتے تھے مرے منہ سے منہ کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
جو غرور تھا وہ انھیں یہ تھا وہ سب ہی غرور ان کو ڈھا گئے

بندھے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ یہ حسرت ان کے گلے پڑی
وہ جو کلیاں تھیں بڑی بڑی وہ انھیں کے پیچ میں آ گئے

کیا خزاں آئی چمن میں ہر شجر جاتا رہا
چین اور میرے جگر کا بھی صبر جاتا رہا

کیا خوشی ہر ایک کو تھی کر رہے تھے سب دعا
جب گھسی فوج نصاریٰ ہر اثر جاتا رہا

کیوں نہ تڑپے وہ ہما اب دام میں صیاد کے
بیٹھنا دو دو پہر اب تخت پر جاتا رہا

شام کو غنچہ کھلا تھا چوک کے بازار میں
اب وہاں پر یا خدا لاکھوں کا سر جاتا رہا

رہتے تھے اس شہر میں شمس و قمر حور و پری
لوٹ کر ان کو کوئی لے کر کدھر جاتا رہا

آگوں تھا یہ شہر دہلی اب ہوا اجڑا دیار
کیوں ظفر یہ کیا ہوا جوبن کدھر جاتا رہا

یہی حسرت تھی کہ گھر میرا مدینے میں رہے
بنا رنگون میں، ارماں میرے سینے میں رہے
آبِ زمزم کے عوض اشکِ خوں پینے میں رہے
لو خبر اس کی کہ چند دن میرے جینے میں رہے
ہے تمنا یہ ظفرؔ کی یا رسولِ عربی
اپنی آنکھوں کو ملے آپ کی چوکھٹ سے نبیؐ

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے اب کون نگر کو من میں اب ہراسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا ہے
کون آشنا کرے ہے واں اور رہتے کون اداسے ہیں
کیا کیا پہلو دیکھے ہم نے گلشن کی پھلواری میں
اب جو پھولے اس میں پھول کچھ اور ہی اس میں بلاسے ہیں
دنیا ہے یہ رین بسارا بہت گئی رہ گئی تھوڑی سی
ان سے کہہ دو سو نہ جاویں نیند میں جو کہ نندا سے ہیں

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

بُلبُل کو پاسباں سے نہ صیّاد سے گِلہ
قسمت میں قید تھی لکھی فصلِ بہار میں

کہہ دو اِن حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

اک شاخِ گل پہ بیٹھ کے بُلبُل ہے شادماں
کانٹے بچھا دیے ہیں دلِ لالہ زار میں!

عُمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کُنجِ مزار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

انتخابِ دیوانِ اوّل

قصیدہ نعتیہ

اے سرورِ دو کون شہنشاہِ ذو الکرم
سرخیلِ مرسلین و شفاعت گرِ اُمم

موکب ترا ملائک و مرکب ترا براق
مولد ترا ہے مکّہ و معبد ترا حرم

رنگِ ظہور سے ترے گلشن رُخِ حدوث
نورِ وجود سے ترے روشن دلِ قدم

تو تھا سر اوجِ رسالت پر جلوہ گر
آدم جہاں ہنوز پسِ پردہ عدم

صدقے زمیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسماں
رکھتا سرِ زمیں نہ اگر اپنا تو قدم

محروم تیرے دستِ مبارک سے رہ گیا
کیوں کر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم

واللّیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا
والشّمس ہے ترے رُخِ پُر نور کی قسم

تیری جناب پاک میں ہے یہ ظفرؔ کی عرض
صدقے سے اپنی آل کے اے شاہِ محتشم

صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دور کر
آئینۂ ضمیر سے میرے غبارِ غم

پہنچا نہ آستانِ مقدّس کو تیرے میں
اس غم سے مثلِ چشمہ ہوئی میری چشم نم

پر خاکِ آستاں کو تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سرمہ میلِ تصور سے دمبدم

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا
اس جا پہ بے زباں ہے دہن قال و قیل کا
پانی ہیں اس نے راہبری کی کلیم کی
آتش میں وہ ہوا چمن آرا خلیل کا
اس کی مدد سے فوجِ ابابیل نے کیا
لشکر تباہ کعبہ پہ اصحابِ فیل کا
کیا پائے کنہہ ذات کو اس کے کوئی ظفرؔ
واں عقل کا نہ دخل نہ ہرگز دلیل کا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
مزہ رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا
یہ نخلِ آہ ہوتا بید ہی کاش!
نہ ہوتا گو ثمر، سایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا
دل اس کی زلف میں اُلجھا ہی کب ہے
ظفرؔ اک روز سلجھایا تو ہوتا

ہاں فرد سوز، اِک دم نہ ہوا پر نہ ہوا
اور گریہ سے بڑھا، کم نہ ہوا پر نہ ہوا

سُن کے نالوں کو مرے ہو گئے پتھر پانی
سرِ مژگاں بھی ترا نم نہ ہوا پر نہ ہوا
ہوں وہ آزاد کہ جوں سرو کسی کی خاطر
قدِ تعظیم مرا خم نہ ہوا پر نہ ہوا
رات ہمسایوں نے اُٹھ اُٹھ کے دعائیں مانگیں
سوزِ نالہ مرا کم نہ ہوا پر نہ ہوا
اے ظفر دیکھئے عقبےٰ میں کہو کیا حال اپنا
چین دُنیا میں تو اک دم نہ ہوا پر نہ ہوا

ہم نے دُنیا میں آ کے کیا دیکھا — دیکھا جو کچھ سو خواب سا دیکھا
ہے تو انسان خاک کا پُتلا — لیک پانی کا بُلبُلا دیکھا
خوب دیکھا جہاں کے خوباں کو — ایک تجھ سا نہ دوسرا دیکھا
اب نہ دیکھئے ظفر کسی کو دل
کہ جسے دیکھا بے وفا دیکھا

زُلف میں بل اور کاکل پُر خم پیچ کے اوپر پیچ پڑا
وہ ہوئی سرکش یہ ہوئی برہم پیچ کے اوپر پیچ پڑا
پیچ سے ہے وہ کرتا یاری باتیں اس کی پیچ کی ساری
نکلیں اس کے پیچ سے کیا ہم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

دل تو کمندِ غم میں پھنسا ہے جانِ اسیرِ دامِ بلا ہے
عشق کے ہاتھوں ناک میں ہے دم پیچ کے اوپر پیچ پڑا
عشق ظفر ہے گورکھ دھندا کھولے اس کے پیچ کوئی کیا
ایک کھلا تو دوسرا محکم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

غمِ دل کس سے کہوں کوئی بھی غمخوار نہیں   غمِ فرقت کے سوا
اور اگر پوچھے کوئی لائقِ اظہار نہیں   چپکا رہتا ہے بھلا
میں ہوں عاشق مجھے غم کھانے سے انکار نہیں   کہ ہے غم میری غذا
تو ہے معشوق تجھے غم سے سروکار نہیں   کھائے غم تیری بلا
سینکڑوں ہیں جگر افگار ہزاروں دل ریش   ترے ہاتھوں لیکن
پاس تیرے کوئی خنجر کوئی تلوار نہیں   ہاں مگر ناز و ادا

دل کا کچھ کام نہ تجھ سے بتِ پُرفن نکلا   دوست جانا تھا تجھے جان کا دشمن نکلا
رات چھیڑا تھا جسے زلف سمجھ کر ہم نے   ہائے شامت کہ وہ اک افعی رہزن نکلا
نام سے کام نکلتا نہیں بے جوہرِ اصل   تل سے عارض کے نہ ہرگز کبھی روغن نکلا
چارہ گر بھر نہ سکے میرے جگر کے ناسور   اک اگر بند کیا دوسرا روزن نکلا

زلف کے سائے تلے وہ رخ اگر چھپ جائے گا
رات کے پردے میں پھر روئے سحر چھپ جائے گا

خوابِ غفلت سے تری جس وقت کھل جائے گی آنکھ
ہے جو کچھ آنکھوں کے آگے جلوہ گر چھپ جائے گا
ڈال مت اشکوں کا پردہ دیکھ تو پیشِ نظر
یار عینِ وصل میں اے چشمِ تر چھپ جائے گا
تاک میں ہیں آج سارے غمزہ و انداز و ناز
ان نظربازوں سے دل بچ کر کدھر چھپ جائے گا

وہ بے حجاب جو کل پی کے یاں شراب آیا
اگرچہ مست تھا میں، پر مجھے حجاب آیا
اِدھر خیال مرے دل میں زلف کا گزرا
اُدھر وہ کھاتا ہُوا دل میں پیچ و تاب آیا
خیال کس کا سمایا ہے دیدۂ دل میں
نہ دن کو چین مجھے اور نہ شب کو خواب آیا

پہلے تو دل میں محبت کا شجر پیدا ہُوا
پھر لگے حسرت کے گُل، غم کا ثمر پیدا ہُوا
خالِ مُشکیں آتشیں رخسار پر پیدا ہُوا
چشمۂ خورشید میں بھی نیلوفر پیدا ہُوا
گریہ ہنگامِ ولادت کیوں نہ ہو ہر طفل کو
جو ہوا دُنیا میں پیدا نوحہ گر پیدا ہُوا

بیچ میں پردہ دوئی کا تھا جو حائل اُٹھ گیا — ایسا کچھ دیکھا کہ دنیا سے مرا دل اُٹھ گیا
شمع نے رو رو کے کاٹی رات سولی پر تمام — شب کو جو محفل سے تو اے زیبِ محفل اُٹھ گیا
میری آنکھوں میں سمایا اس کا ایسا نورِ حق — شوقِ نظارہ ترا اے بدر کامل اُٹھ گیا

اے ظفر کیا پوچھتا ہے بے گناہ و باگناہ
اُٹھ گیا اب تو جدھر کو دستِ قاتل اُٹھ گیا

نہ درویشوں کا خرقہ چاہیئے نے تاجِ شاہانہ
مجھے تو ہوش دے اتنا کہ ہوں میں تجھ پہ دیوانہ

نہ دیکھا وہ کہیں جلوہ جو دیکھا خانۂ دل میں
بہت مسجد میں سر مارا بہت سا ڈھونڈا بت خانہ

کچھ ایسا ہو کہ جس سے منزلِ مقصود کو پہنچوں
طریقِ پارسائی ہو کہ ہووے راہِ رندانہ

یہ ساری آمد و شُد ہے نفس کی آمد و شُد پر
اُسی تک آنا جانا ہے نہ پھر جانا نہ پھر آنا

ظفر وہ زاہدِ بے درد کی ہو ہا حق سے بہتر ہے
کرے گر رند دردِ دل سے ہاؤ ہوئے رندانہ

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں یہ جو دل پہ رنج و ملال تھا
وہ جب آ گئے مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

پسِ پردہ سُن کے تری صدا ترا شوقِ دید جو بڑھ گیا
مجھے اضطراب کمال تھا، یہی وجد تھا، یہی حال تھا

ظفر اس سے چھُٹ کے جو جُست کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا نہ کوئی جال تھا

جبکہ وہ خط پڑھ کے بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا
دل جلا اور دل کا دھڑکا اور دھڑک کر رہ گیا

سُن کے نالہ اور جوشِ گریہ میرا دیکھ کر
آسماں پر ابر کڑکا اور کڑک کر رہ گیا

ہر نفس اس دامنِ مژگاں کی جنبش سے ظفر
دل میں اک شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے مٹا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رُخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کون سی شب مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا!

کئی روز میں آج وہ ماہِ لقا۔ ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما!
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا۔ اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

تیرے خنجر و تیغ کی آب رواں، ہوئی جب کہ سبیل ستم زدگاں!
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں، کوئی تشنۂ آب بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو کے خون جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر، کف پا پہ جو رنگ حنا نہ رہا

ہمیں ساغر و بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط، یہ دور طرب، نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کیے لاکھ فریب ہزار فسوں، نہ رہا نہ رہا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے — کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے — کاش سنگ در جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو — عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے نہ تھا جو لائق صحبت تو مجھے — قابل جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوری ساقی سے مجھے — تو چراغ رہ مے خانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

خدا جانے حلاوت کیا تھی آب تیغ قاتل میں لب ہر زخم ہے گویا اہاہاہا اہاہاہا
شرار و برق میں کیا فرق سمجھوں میں کہ دونوں میں ہے اک شعلہ بھبو کا سا اہاہاہا اہاہاہا
مری صورت پرستی حق پرستی ہے کہوں میں کیا کہ اس صورت میں ہی کیا کیا اہاہاہا اہاہاہا
ظفرؔ میں کیا کہوں عالم طبیعت کی روانی کا
کہ ہے امڈا ہوا دریا اہاہاہا! اہاہاہا

تیر تیرا جس کے سینے سے گزر کر جائے گا آپ جائیگا گزر پر دل میں گھر کر جائے گا
وہ مقام عیش ہی دنیا کہ یاں سے جیتے جی کون جاتا ہی اگر جائے گا مر کر جائے گا
تیری ہستی پیش خیمہ ہے یہ تیرا اے حباب اب تو کوئی دم میں یاں سی تو سفر کر جائے گا
کر گیا گر اک تبسم باغ میں آ کر وہ گل
دیکھنا غنچہ کا سو ٹکڑے جگر کر جائے گا

مری جانب سے غیروں نے لگایا کچھ نہ کچھ ہوگا
نہ آیا وہ تو اس کے جی میں آیا کچھ نہ کچھ ہوگا

اڑے ہیں میکدہ میں آج یوں شیشہ و ساغر
کرشمہ چشم ساقی نے دکھایا کچھ نہ کچھ ہوگا
نہ ڈھونڈا اور نہ پایا ہم نے کچھ اس بحر ہستی میں
وگرنہ جس نے ڈھونڈا اس نے پایا کچھ نہ کچھ ہوگا
سنا ہیں نے کٹی ان کی بھی ساری رات آنکھوں میں
کسی نے میرا افسانہ سنایا کچھ نہ کچھ ہوگا

شعلۂ حسن تو اوروں کو دکھا کے مارا
تو نے ظالم ہمیں بے آگ جلا کے مارا
سوتے تھے چین سے ہم خواب عدم میں لیکن
شور ہستی نے ہمیں آہ جگا کے مارا
چین سے گھر میں پڑے کرتے تھے باتیں دل سے
وحشت عشق نے دے ہم کو اٹھا کے مارا
نالہ بھی کرنے نہ پائے کہ نکلتی حسرت
ہم کو اے عشق گلا تو نے دبا کے مارا
آنکھوں آنکھوں ہی ہمیں اس بت بیدرد نے آہ
تیغ سے ناز کے خنجر سے ادا کے مارا
تو جو مہتابی پہ کل رات کھڑا گاتا تھا
دائرہ مہ بھی لئے ساتھ کئے جاتا تھا

بندھ گئی تھی ہوا گانے کی وہ تیری کہ مرا
ساتھ ہر تان کے جی تھا کہ اُڑا جاتا تھا
کیا کہوں رقص کا عالم عجب انداز کے ساتھ
ساتھ ٹھوکر کے تری ٹھوکریں دل کھاتا تھا
ہاتھ کو ہاتھ پہ تو رکھ کے لگا جب چلنے
ہاتھ ہم ملتے تھے، دل تھا کہ ملا جاتا تھا
دامن اپنا تو اُٹھا چلتا تھا اس ناز کے ساتھ
گھیرا دامن کا مجھے گھیر کے لے آتا تھا
آنکھ چاہت کی ظفرؔ کوئی بھلا چھپتی ہے!
اس سے شرماتے تھے ہم، ہم سے وہ شرماتا تھا

تیرا صید ناز جو لوہو میں ہے ڈوبا ہُوا
تیر برقِ چشم کا پہلو میں ہے ڈوبا ہُوا
اشک سے اُس قامتِ رعنا کے یاد کیا عجب
مثلِ سایہ سرو آبِ جو میں ہے ڈوبا ہُوا
دیکھ کر اس کو ہُوا تھا میں جو غرقِ آبِ شرم
اب تلک سر کاسۂ زانو میں ہے ڈوبا ہُوا
لوگ کہتے ہیں کہ پانی میں نہیں خس ڈوبتی
میرا ہر موئے مژہ آنسو میں ہے ڈوبا ہُوا

یہ آسماں غلام ہے کس مہ جمال کا
پہنے پھرے ہے کان میں بالا ہلال کا
ہوتا ہے چودھویں کو ہمیشہ نہ خوفِ ماہ
جو دن کمال کا ہے وہی ہے، زوال کا

غیرت کہے ہے قبرِ سکندر کو دیکھنا
یارو کچھ اعتبار نہیں ملک و مال کا
بارش سے میری ابرِ مژہ کی عجب نہیں
موسم رہے تمام برس برشگال کا

نہ ہرگز دردِ دل سے ہیں کراہا
غرض پوشیدہ الفت کو نباہا
محبت کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے
وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا
فقیروں سے تو پوچھو لذتِ عشق
اہاہاہا، اہاہاہا، اہاہاہا
ظفرؔ کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخشا، کرم گارا، الٰہا!

ہماری آنکھوں سے جس وقت خونِ ناب بہا
پھرے گا گنبدِ افلاک جو حباب بہا
ستارے آئے نظر آفتاب پر ہم کو
عرق جو رُخ پہ ترے رشکِ آفتاب بہا
کھُلا اگر کبھی واعظ پہ ایک نکتۂ عشق
یقیں ہے، دیوے گا دریا میں ہر کتاب بہا

جگر کا درد میاہی میں گر سحاب بنا
تو دل کا داغ بھی تابش میں آفتاب بنا
یہ جوشِ اشک رہا زیرِ خاک بھی اپنا
کہ جو مزار کا گنبد تھا وُہ حباب بنا

جلایا دل جو ترے شعلۂ نگاہ نے رات — فلک پہ نالہ مرا ناوکِ شہاب بنا
دلِ شکستہ کی تو میرے کچھ درستی کر — خدا کا گھر ہے بنایا بڑا ثواب بنا
ہوئی نہ پاؤں تلک اس کے دسترس افسوس — ہمارا دیدہ نہ کیوں حلقۂ رکاب بنا

ظفر جو لکھنا ہے احوال دل تجھے اپنا
تو ایک رقعہ سے کیا ہووے گا کتاب بنا

گورِ گنجِ فراغ ہے اپنا — داغ اپنا چراغ ہے اپنا
کون ہے کنجِ حزن میں دمساز — اک دل سوز داغ ہے اپنا
ڈھونڈتا ہے خدا کو تو زاہد — ہم کو قصدِ ایاغ ہے اپنا
جب سے اس مہ جبیں کے عاشق ہیں — آسماں پر دماغ ہے اپنا

اے ظفر کیجئے سیرِ وسعتِ دل
کہ یہی باغ و راغ ہے اپنا

نہ تو اپنا رہا نہ بیگانہ رہا — جو رہا سو کسی کا فسانہ رہا
مرا سینہ و دل مری جان و جگر — ترے تیر نگہ کا نشانہ رہا
رہی کثرتِ داغ، بدولتِ غم — مرے پاس ہمیشہ خزانہ رہا
گیا موسم، گردش ساغر مے — نہ وہ دور رہا نہ زمانہ رہا

ظفر اس کی تو زلف میں دل ہے مرا
مرے پاس بلا سے رہا نہ رہا

جب کھلکھلا کے ساقئ گل فام ہنس پڑا
شیشے نے قہقہے لیئے اور جام ہنس پڑا

غنچہ کا منہ ہے کیا کہ تبسّم کرے گا پھر
گلشن میں گر وہ شوخِ گل اندام ہنس پڑا

سیراب آبِ تیغ سے ہو کر بہ رنگِ گل
ہر ایک زخمِ عاشق ناکام ہنس پڑا

کیا بات یاد آگئی اس کو کہ اے ظفرؔ
وہ یک بیک جو سن کے مرا نام ہنس پڑا

وہ نہ آیا یار لائے، یوں نہ تھا تو یوں ہوا
اس کا آنا بن بلائے یوں نہ تھا تو یوں ہوا

صبر گر ہوتا مجھے، ہوتا نہ میں رسوائے خلق
کہتے ہیں اپنے پرائے یوں نہ تھا تو یوں ہوا

دے کے اس بے درد کو دل ہوں ظفرؔ میں دردمند
واہ دکھ بیٹھے بٹھائے یوں نہ تھا تو یوں ہوا

دیا ہے جس نے وہاں تک خیال کو پہنچا
مرے خیال میں ہے وہ کمال کو پہنچا

تجھے بھی رنج جو پہنچا کسی سے خوب ہوا
اذیت اور دل پر ملال کو پہنچا

ہر ایک کرتا ہے احوال پر میرے افسوس
غمِ فراق سے میں ایسے حال کو پہنچا

کیے تھے تھے اخلاق دل لینے کو سو دل لے چکے — کیا بتاؤں میں کہ ان کا پیار کیا تھا کیا ہوا

ہو گیا جو کچھ کہ ہونا تھا مری تقدیر میں — کیا بتاؤں میں کہ اے غمخوار کیا تھا کیا ہوا

سرکشی کرتا ہے کیا کیا اپنی ہستی پر حباب — دیکھنا اک دم میں یہ پندار کیا تھا کیا ہوا

لے گیا وہ نیم غمزے میں جو دل کو اے ظفرؔ
ہو گیا حیران میں یک بار کیا تھا کیا ہوا

کیا کہوں دل مائلِ زلفِ دوتا کیونکر ہوا — تھا بھلا چنگا گرفتارِ بلا کیونکر ہوا

جو نہ ہونا تھا ہوا ہم پر تمہارے عشق میں — تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا کیونکر ہوا

وہ تو ہے ناآشنا مشہور عالم میں ظفرؔ
پر خدا جانے وہ تجھ سے آشنا کیونکر ہوا

روئے جو دل کو کھول کر ٹکڑے جگر ہونے لگا
اور اگر رونے کو روکا درد سر ہونے لگا
کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے
دل سے میں مجھ سے مرا دل بے خبر ہونے لگا

دیکھے دنیا کو جو اوّل سے کوئی آخر تک — پائے آغاز سے وہ اور بھی انجام خراب

گر نہیں آئینہ تو دل ہی کو تُو دیکھ اپنے — عمر بے شغل نہ کر غافل خود کام خراب

دیکھ صیّاد اسیروں کو نہ بھڑکا اپنے — خونفشانی سے کریں گے قفس و دام خراب

چشموں سے رواں کیوں نہ ہو مژگاں کے تلے آب
جاری رہے ہے سروِ گلستاں کے تلے آب
ہے عشق کا دریا دلِ پُر سوز میں پنہاں
حیراں ہوں کہ ہے آتشِ سوزاں کے تلے آب
کس پائے برہنہ کا ظفر آبلہ پھوٹا
صحرا میں جو ہے خارِ مغیلاں کے تلے آب

جس کی آنکھوں کو نہ تیری خواہشِ دیدار ہو
اس کو دیدار خدا ہووے نہ اے کافر نصیب
مت اٹھا آسودگانِ خاک کو اے روزِ حشر
اک ذرا راحت ہوئی ہے ان کو مر مر کر نصیب
آتے آتے اُلٹے میرے در سے پھر جاتے وہ کیوں
اے ظفر برگشتہ ہو جاتے نہ گر میرے نصیب

اُٹھ کے پہلو سے ہمارے جس طرف جائیں گے آپ
مثلِ سایہ آپ کے ہمراہ ہم آئیں گے آپ
بے سبب چرخ ہے اک بر سرِ کیں آپ سے آپ
سر پھرا اور کسی کا تو نہیں آپ سے آپ

کیجئے نہ دس میں بیٹھ کے آپس کی بات چیت
پہنچے گی دس ہزار جگہ دس کی بات چیت
کب تک رہیں خموش کہ ظاہر سے آپ کی
ہم نے بہت سنی کس و ناکس کی بات چیت
مدت کے بعد حضرت ناصح؟ کرم کیا
فرمایئے مزاج مقدس کی بات چیت
پر ترکِ عشق کے لیئے ارشاد کچھ نہ ہو
میں کیا کروں نہیں یہ مرے بس کی بات چیت
کیا یاد آ گیا ہے ظفر پنجۂ نگار
کچھ ہو رہی ہے بند و مخمس کی بات چیت

کہہ بیٹھوں جو سوزِ غمِ ہجراں کی حقیقت — کچھ بھی نہ رہے آتشِ سوزاں کی حقیقت
تدبیر رفو کیا ہو کہ اب دستِ جنوں میں — رکھی نہ مری کچھ بھی گریباں کی حقیقت
آنکھوں سے ہے یہ دیدۂ گریاں نے دکھایا — کانوں سے سنا کرتے تھے طوفاں کی حقیقت
جو حرف ہے مطلب کا وہ اشکوں سے بہے ہے — کیا خط میں لکھوں میں غمِ پنہاں کی حقیقت
حاضر ہے دل و جاں کہ ظفر یار کے آگے
کچھ دل کی حقیقت ہے نہ کچھ جاں کی حقیقت

سب کارِ جہاں ہیچ ہے سب کارِ جہاں ہیچ — اس ہیچ سے امید ہے اے ہیچ مداں ہیچ

اک عمر یہ ہے سایۂ دنیا سے گراں بار — آخر کو جو دیکھا تو بجز بارِ گراں ہیچ
اس باغ میں تھوڑی سی بہار اور پھر اس پر
اے تو گلِ خنداں مجھے تشویشِ خزاں ہیچ!

زُلف اپنی رُخ پہ دیکھ ذرا لے کے آئینہ
دریا پہ گر نہ دیکھا ہو تُو نے سحابِ صبح
پیری میں گر حلاوتِ غفلت زیادہ ہو
یارو عجب نہ سمجھو کہ شیریں ہے خوابِ صبح

خارِ صحرائے جنوں یوں ہی اگر تیز رہے — کوئی آنے کا نہیں آبلہ پا میرے بعد
اس ستمگر نے مجھے جرمِ وفا پہ مارا — کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد
اے ظفر کیوں کہ محبت کو نہ ہو غم میرا
کوئی غمخوارِ محبت نہ ہوا میرے بعد

جو عرش سے ہے فرش تلک آدمی میں ہے — دیکھ آنکھ کھول کر
کیا کیا نہیں ہے اس میں کہ سب کچھ اسی میں ہے — پر چاہیئے نظر
دل اپنا پہلے زنگِ کدورت سے صاف کر — مانند آئینہ
پھر تُو بہ غور دیکھ کہ اس آرسی میں ہے — کیا حُسن جلوہ گر
پیدا نگاہ کر کہ تجلّیِ حُسنِ یار — ہر جا ہے آشکار

شعلہ سے طور کے نہیں کم روشنی میں ہے — ہر سنگ کا شرر
کیوں کعبہ و کنشت میں سر مارتا ہے تو — سر گرم جستجو
تو ڈھونڈتا ہے جس کو چھپا وہ تجھی میں ہے — پر تو ہے بے خبر
ہے دورِ جام و صحبتِ یارانِ زندہ دل — کیفیتِ حیات
کچھ ہے اگر مزا تو یہی زندگی میں ہے — باقی ہے دردِ سر
افشائے رازِ عشق نہ کر کہہ کے جی کی بات — پر وہ ہی خوب ہے
جی ہی میں اپنے رہنے دے جو کچھ کہ جی میں ہے — خاموش اے ظفر

تری ہے پازیب و سر کا جھومر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
ہوئے ہیں جلوہ نما چمک کر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
وفورِ اشکوں کا ہے ہمارے، نکلتے نالوں میں ہیں شرارے
نہ کیوں کہ ہوں عرش پہ نچھاور، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
پھپھولے پاؤں میں ہیں نمایاں، تو سر پہ داغِ جنوں فروزاں
نہ دیکھیں دیوانے تیرے کیوں کر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
ذرا جبینِ عرق فشاں پہ تو اپنی، افشاں دکھا دے چن کر
کہ تا نظر آئیں ماہ پیکر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
نہ سبزہ و گل پہ جوشِ شبنم، نہ چمکے جگنو ہوا پہ ہر دم
نظر شب آتے تھے مجھ کو یکسر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
اُدھر تو فوارے چھوٹتے ہیں ادھر ہیں اشجار پر چراغاں
نئی ہے سیر اک چمن کے اندر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

زمیں نہایت ہی بھی یہ مشکل ظفرؔ ہے استاد پہ وہ کامل
غرض دکھادی وہی بنا کر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

پہنچتے ہیں کہیں مر مر کے تا سرِ منزل
عزیز و راہِ عدم اس قدر ہے دور و دراز
خرامِ یار کے نزدیک ہے بہت نزدیک
وگرنہ فتنۂ محشر ظفرؔ ہے دور و دراز

کئے ہی جاتے ہیں راہِ فنا کو طے ہر دم
سمجھتی کچھ نہیں عمرِ رواں نشیب و فراز
کسی کو پست کرے ہے فلک کسی کو بلند
کہ اس ہنڈولے میں ہے ہر زماں نشیب و فراز

دیکھ چھپائے گا تو چھوڑ نہ دل کو میرے
ہاتھ آئی ہے ترے مفت یہ نایاب سی چیز
موت سے دیکھ اب نہ غافل ہو ذرا آنکھ تو کھول
زندگی کہتے ہیں جس کو وہ ہے اک خواب کی چیز
کام زخمِ دلِ عاشق کو نہیں مرہم سے
اس پہ جراح لگا دے کوئی تیزاب سی چیز
بے تمیزی ہے یہاں تک کہ زمانے میں ظفرؔ
نہ وہ تنظیم سی شے ہے نہ وہ آداب سی چیز

ہم کو رخصت ہو کہ بس آپ کی صحبت کے شریک
رات دن رہنے لگے سب کس و ناکس اجی بس
کیوں مقابل ہوئے تھے حضرتِ دل عشق کے تم
ہو چکا آپ کا اتنے ہی میں دم کس اجی بس
پوچھو مت حضرتِ ناصح مرا آ کر احوال!
سُن کے مغموم نہ ہو خاطرِ اقدس اجی بس
تار رونے کا جو باندھا تو نہ توڑا ہم نے
ہم سے ہر چند وہ کہتے رہے ہنس ہنس اجی بس

جان و دل، تاب و تواں، ہوش و خرد، صبر و قرار
لے چکے اور بھی کچھ ہے تمہیں درکار کہ بس
اے ظفر دل نہ ہو کس طرح سے مضطرِ بے طرح
آج اس طرح کا دیکھا ہے طرحدار کہ بس

بھولا نہ تجھے یہ کبھی اس یاد کو شاباش
شاباش ہمارے دلِ ناشاد کو شاباش
ہر روز ستم تازہ ہے ہر روز نیا ظلم
اے شوخ ستمگر تری ایجاد کو شاباش
گویائی اگر ہوئے لبِ زخمِ جگر کو
اتنا کہے اس خنجرِ بیداد کو شاباش!
الحمد للہ کہ ہوئی اتنی تو تاثیر
کہتے ہیں وہ سُن کر مری فریاد کو شاباش
مرغِ چمن تُو رہا بس کو اس دام سے کیا کام
پر کھینچ ہی لایا مجھے صیاد کو شاباش

ہے لاکھ خیالات ہیں فکرِ سخن ایسا
تیری ظفر اس طبع خداداد کو شاباش

وہ چشم ہو کیونکر سحر و شام فراموش
میں مست ہوں مجھ سے ہو کیوں جام فراموش
ہو جس سے کہ ایک بار ترا نام فراموش
وہ یاد دو عالم سے ہو ناکام فراموش
لے سر پہ وبال اپنے اسیروں کا نہ صیاد
اتنا بھی نہ ہو رکھ کے تہِ دام فراموش
اک میں بھی ترے دور میں ہوں رندِ سبوکش
کر مجھ کو نہ اے ساقیِ گلفام فراموش

ساقی نہ دکھا بزم میں تو جام کی گردش
یاد آتی ہے چشمِ بتِ خودکام کی گردش
پھرتی ہے مری خاک بگولے میں ہمیشہ
اب تک بھی مرے ساتھ ہے ایام کی گردش
اک شب نہ مرے پاس وہ آیا مہِ تاباں
گردوں نے نہ کی ایک مرے کام کی گردش

نہ ملک پہ ہے نظر اور نہ مال و زر کی تلاش
نظر کو اپنی ہے اک شوخ خوش نظر کی تلاش
ہمیشہ پیکِ تصور رہا میرا قاصد
کبھی ہوئی نہ مجھے مرغِ نامہ بر کی تلاش
چمکتی ابر میں ہے برق، مے کشو لو جام
حریف تیغ بکف ہے کرو سپر کی تلاش

کرتے ہیں بہت صاحبِ تدبیر پس و پیش
پر دیکھئے کیا کرتی ہے تقدیر پس و پیش

دل پہلے پھنسا زلف میں جاں جس کے پیچھے
دونوں ہوئے وابستۂ زنجیر پس و پیش

جب تک کہ رہا دم مرے دل میں بھر راہی
آہِ سحر و نالۂ شبگیر پس و پیش

دم جائے گا ساتھ اس کے پئے مرگ کوئی دم
شاید ہو ترے باعثِ تاخیر پس و پیش

پیکاں ہے سرِ پشت سر سینہ ہے سوفار
کیا خوب برابر ہے ترا تیر پس و پیش

دل جن کا ہے روشن وہ ظفرؔ صورتِ خورشید
یکساں ہے سدا باعثِ تنویر پس و پیش

ہر طرح غیر کی دل جوئی ہے معقول چہ خوش
ہم سے ہر بات پہ بد خوئی ہے معقول چہ خوش

بات معقول کہوں میں تو کہے طرز سے وہ
تو اتالیق مرا کوئی ہے معقول چہ خوش

گریہ ہے ختم فقط سوختہ جاں پر میری
کہتے ہیں شمع بھی کچھ روئے ہے معقول چہ خوش

میری آہِ آتشیں رکھتی ہے اب تاثیرِ برق
بلکہ دی اس نے گھٹا سب عزت و توقیرِ برق

گرم رو کو عشق کی دل کی تپش دے ہے اڑا
ابر کو کب روک سکتی ہے بھلا زنجیرِ برق

چند دن کی زندگی کس کو کریں باہم رفیق — دل ہی مونس ہے ہمارا اور یہ اپنا دم رفیق

میرے دامن سے لگے رہویں نہ کیونکر خارِ دشت
جوشِ وحشت میں بھی تو ہیں میرے اب ہمدم رفیق

نہ کیجے ہم سے بہت گفتگو تڑاق پڑاق — وگرنہ ہووے گی پھر دو بدو تڑاق پڑاق
الٰہی محتسبِ سنگدل کے ٹوٹیں ہاتھ — کہ توڑتا ہے یہ جام و سبو تڑاق پڑاق

ظفرؔ مزاج جو شوخی پسند ہے اپنا
تو چاہتا ہے کوئی خوب رُو تڑاق پڑاق

نہ خونِ دل میں مرے اور نے شراب میں فرق
نہ میرے سینۂ بریاں میں اور کباب میں فرق
نہ میرے اشک میں اور تارِ چنگ میں دوری
نہ میرے نالہ میں اور نغمۂ رباب میں فرق
نہ لعل و پارۂ دل میں مرے تفاوت کچھ
نہ آنسوؤں میں مرے اور دُرِ خوش آب میں فرق
نہ داغ سینہ میں اور آفتاب میں ہے دوئی
نہ دودِ دل میں مرے اور کچھ سحاب میں فرق
نہ سوزِ سینہ میں اور برق میں ہے فرق ظفرؔ
نہ کچھ ہے پارہ میں اور دل کے اضطراب میں فرق

نکلے رگِ مجنوں سے دمِ فصد لہو کیا کانٹا سا بنا اس کا تو وحشت میں تنِ خشک
غربت میں اگر آبِ بقا بھی ہو تو اس سے بہتر مرے نزدیک ہے خاکِ وطنِ خشک
سوزاں ہے تری آہ ظفرؔ آتشیں دل سے
یوں جیسے جلے آگ میں کوئی رسنِ خشک

دیکھا بل کھاتے جو دودِ شمع کو محفل میں رات
یاد آئے شعلہ رُو مجھ کو ترے گیسو کے بل
جاتے ہیں کیا کیا گھسیٹے رہرو راہِ وفا
سر کے بل پاؤں کے بل سینہ کے بل بازو کے بل
سیدھے کب ہوتے ہیں جن کی ہے طبیعت میں کجی
کس طرح کوئی نکالے موجِ آبِ جُو کے بل

برائی یا بھلائی گو ہے اپنے واسطے لیکن
کسی کو کیوں کہیں ہم بد کہ بدگوئی سے کیا حاصل
نہ کر فکرِ خضاب اے شیخ تو پیری میں جانے دے
جواں ہونا نہیں ممکن سیہ روئی سے کیا حاصل
نہ ہووے جب تلک انساں کو دل سے میل یک جانب
ظفرؔ لوگوں کے دکھلانے کو یکسوئی سے کیا حاصل

نے قاصدِ دل ہے نہ کوئی نامہ برِ دل
ہو جائے ہے کچھ آپ ہی دل کو خبرِ دل
تا منزلِ مقصود پہنچنا نہیں ممکن
ہووے نہ اگر شوق تیرا راہبرِ دل

زیبا ہو کیوں نہ ہاتھ میں ساقی کے جامِ مے
وہ ہے برنگ شاخ تو یہ ہے بجائے گل
ڈرتا ہے میرے صرصرِ نالے سے آسماں
خورشید کا چراغ کہیں ہو نہ جائے گل
ہے ربط حسن و عشق کو آپس میں اے ظفر
گل ہے برائے بلبل و بلبل برائے گل

فنا ہے ساتھ تو پھر زندگی سے کیا حاصل
فنا سے پہلے فنا ہو کہ ہو بقا حاصل
جو دل کو صاف ہو کرنا تو خاکساری کر
کرے ہے خاک سے دیکھ آئینہ صفا حاصل

مر گئے اے وائے انکی نازبرداری میں ہم
دل کے ہاتھوں پڑ گئے کیسی گرفتاری میں ہم
سب پہ روشن ہے ہماری سوزشِ دل بزم میں
شمع ساں جلتے ہیں اپنی گرم بازاری میں ہم
کب ہنسایا گردشِ گردوں نے ہم کو شکلِ گل
مثلِ شبنم ہیں ہمیشہ گریہ و زاری میں ہم

تیرے جس دن سے خاکِ پا ہیں ہم
خاک ہیں لیک کیمیا ہیں ہم

ہمدمو! مثل صورتِ تصویر
کیا کہیں تم سے بے صدا ہیں ہم

تیرہ بختی میں ہیں بہ بختِ سفید
کیا مگر سایۂ ہُما ہیں ہم

اے ظفرؔ پوچھتا ہے ہم کو صنم
کیا کہیں بندۂ خُدا ہیں ہم

کرتے غرہ سے جو یہ دعویٰ ایماں ہیں ہم
کُفر یہ ہے اسے توڑیں تو مسلماں ہیں ہم

کیونکہ کچھ لے سکیں ہم وہ ہی نہ دیوے جب تک
صاحبِ خانہ یہاں اور ہے مہماں ہیں ہم

نہ تو ہیں نکہتِ گل اور نہ ہم دودِ چراغ
پر یہ ہے حال کہ با حالِ پریشاں ہیں ہم

ہم دمو جس دن محبت میں قدم رکھیں گے ہم
دیکھ لینا اس کو بھی اپنا سا کر رکھیں گے ہم

جان و دل تاب و تواں لو تم ہی رکھو اپنے پاس
یاں ہجومِ غم میں کس کس کی خبر رکھیں گے ہم

گزرے ہم اس سر سے قاتل کیا کرینگے رکھ کے سر
ایک سر کے ساتھ سو کیوں دردِ سر رکھیں گے ہم

اے ظفرؔ سو چکے آرام سے ہم پاؤں پسار
سو قیامت ہوئی اک آنکھ کے لگ جانے میں

کوئی دم بھر کی ہستی میں غنیمت ہے ہمیں رہنا
حبابِ آسا ابا لب عمر کا پیمانہ رکھتے ہیں

الٰہی جلوہ فرما کون ہے یاں روز و شب ایسا
مہ و خورشید جو بن کر تماشائی سے پھرتے ہیں

چڑھا ہے کوٹھے پہ کون اپنے کہ دیکھنے کو اب آہ جس کے
بگولا بن کر یہاں فلک سے کرے ہے اپنا غُبار باتیں
نہ ہم کو دم دیجے۔ آپ ہر دم بھریگے اُلفت کے تیری ہی دم
ہوئی کسی کے ہے آگے ہمدم یہ سب ہیں کہنے کی یار باتیں

یا تو اپنے پاس تھے وہ یا قریب اوروں کے ہیں
جو نصیب آگے تھے اپنے وہ نصیب اوروں کے ہیں
تیرے نالے وہ بلا جانکاہ ہیں اِک گُل تو کیا
کرتے یہ دل میں اثر اے عندلیب اوروں کے ہیں
عشق کی تعلیم ہے ہم کو جنُوں کی تربیت
عقل سے کہد و کہ حضرت آپ ادیب اوروں کے ہیں
ایسے بخت اپنے کہاں آئے ہمارے گھر وہ ماہ
اے ظفر اس امر میں طالع عجیب اوروں کے ہیں

تھک کے ہم راہِ محبت میں جہاں بیٹھے ہیں — اور وہاں ہم سے بہت آہ رواں بیٹھے ہیں
نشۂ غفلت کا ہے اتنا کہ نہیں سوجھتا کچھ
آئے کس جا سے ہم اور کہاں بیٹھے ہیں

تدبیر کو سو طرح کی تدبیر سے بدلوں — تقدیر کو کس طرح سے تقدیر سے بدلوں
وا شد ہی نہیں دل کو ظفرؔ آہ جو بس ہو — اس غنچے کو میں غنچۂ تصویر سے بدلوں

رات دن تیرا تصوّر ہے خیال اور نہیں
کہ سوا اس کے محبت کا کمال اور نہیں
آپ ہیں ڈھونڈ اُسے اور کہاں ڈھونڈے گا
کہ بجز تیرے کہیں جائے وصال اور نہیں
دل انساں کے آئینہ ہیں دیکھ اس کو ظفرؔ
کہ نظیر اس کا نہیں اس کی مثال اور نہیں

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ مے خواروں میں ہوں
اے بُتو بندہ خدا کا ہوں گنہ گاروں میں ہوں
میری ملت ہے محبت، میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دیں داروں میں ہوں
صفحۂ عالم پہ مانندِ نگیں مثلِ قلم
یا سیہ رویوں میں ہوں میں یا سیہ کاروں میں ہوں

صورتِ تصویرِ مینکش مے کدے میں دہر کے
کچھ نہ مدہوشوں میں ہوں میں اور نہ ہوشیاروں میں ہوں
نے مرا مونس ہے کوئی اور نہ کوئی غمگسار
غم مرا غمخوار ہے میں غم کے غمخواروں میں ہوں
جو مجھے لیتا ہے پھر وہ پھیر دیتا ہے مجھے
ہیں عجب اک جنسِ ناکارہ خریداروں میں ہوں
اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ کو جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخرِ دیں کے کفش برداروں میں ہوں

چیدہ چیدہ مہ جبیں اچھے جو دل بُردہ سے ہیں
ہم سے کچھ چیں بہ جبیں رہتے ہیں آزردہ سے ہیں
نیستی پھیرا خزاں کا کیا پھر آیا باغ میں
پھول پژمُردہ سے ہیں مرغِ چمن مُردہ سے ہیں
تیرا قامت وہ قیامت ہے کہ اے محشر خرام
فتنہ و ہنگامہ دونوں جس کے آوردہ سے ہیں
شعر افسردہ ظفر کے مت سناؤ بزم میں
عشق کے مارے ہوئے جتنے ہیں افسردہ سے ہیں

یوں تو افسانہ مرا وہ نہیں سنتا اے دل
اس سے یہ قصۂ دردِ خواب کہے تو کہہ دوں؟

کہیں میں غنچہ ہوں واشُد سے اپنی خود پریشاں ہوں
کہیں گوہر ہوں اپنی موج میں میں آپ غلطاں ہوں
کہیں میں ساغرِ گُل ہوں کہیں میں شیشۂ مُل ہوں !!
کہیں میں شورِ قلقل ہوں کہیں میں ہوئے مستاں ہوں
کہیں میں جوشِ وحشت ہوں کہیں میں محوِ حیرت ہوں !!
کہیں میں آبِ رحمت ہوں کہیں میں داغِ عصیاں ہوں
کہیں میں برقِ خرمن ہوں کہیں میں ابرِ گلشن ہوں !!
کہیں میں اشکِ دامن ہوں کہیں میں چشمِ گریاں ہوں
کہیں میں عقل آرا ہوں کہیں مجنونِ رسوا ہوں !!
کہیں میں پیرِ دانا ہوں کہیں میں طفلِ ناداں ہوں
کہیں میں دستِ قاتل ہوں کہیں میں حلقِ بسمل ہوں !!
کہیں زہرِ ہلاہل ہوں کہیں میں آبِ حیواں ہوں
کہیں میں سروِ موزوں ہوں کہیں میں بیدِ مجنوں ہوں
کہیں گُل ہوں ظفرؔ میں اور کہیں خارِ بیاباں ہوں

قتل کریں اک عالم کو وہ ابروئے پُرخم ایسے ہیں
ان شمشیروں کے ہیں مقابل دیکھو ہاں ہم ایسے ہیں
اتنا کھایا غم دنیا میں غم کے پُتلے بن گئے ہم
اس پر بھی کچھ غم نہیں ہم کو ہم بھی بے غم ایسے ہیں
گُل ہے کہیں اور خار کہیں ہے نور کہیں اور نار کہیں ہے
ایک ہی عالم کیا ہے ہزاروں اس کے عالم ایسے ہیں

کیونکہ ہم دنیا میں آئے کچھ سبب کھلتا نہیں — اک سبب کیا بھید واں کا سب کا سب کھلتا نہیں
دل ہے یہ غنچہ نہیں ہے اس کا عقدہ اے صبا — کھولنے کا جب تلک آئے نہ ڈھب کھلتا نہیں
شاہدِ مقصود تک پہنچیں گے کیوں کر دیکھئے — بند ہے بابِ تمنا ہے غضب کھلتا نہیں
کس طرح معلوم ہووے اس کے دل کا مدعا
مجھ سے باتوں میں ظفر وہ غنچہ لب کھلتا نہیں

جی میں کیا تیرے سمایا اسے کیا کہتے ہیں — ہم سے ہر وقت کنایا اسے کیا کہتے ہیں
پوچھا ہر چند بھرے کان تمہارے کس نے — نہ بتایا نہ بتایا اسے کیا کہتے ہیں
گرمیِ خون سے سُلگتا ہی تھا دل اور ظفر — مہر چہری نے جلایا اسے کیا کہتے ہیں

وہ تیر اور ہے جس تیر کا فگار ہوں میں — وہ دام اور ہے جس دام کا شکار ہوں میں
وہ کارواں کہ جو منزل پہ اپنی جا پہنچا — اسی کے پیچھے رواں صورتِ غبار ہوں میں

نہ میں ہوں طائرِ بسمل نہ ماہیِ بے آب الٰہی کیا ہوں میں بیتاب بیقرار ہوں میں
سمجھتے عشق میں بے ہوش و بیخبر ہیں مجھے
خبر نہیں کہ خبردار و ہوشیار ہوں میں

چھپ کے وُہ بیٹھ رہیں مجھ سے یہ ممکن ہی نہیں
میں سر کٹنے نہیں دینے کا نظر میں سے اُنھیں
دل وہ کب چھوڑتے ہیں اسے تنِ لاغر میرا
ثمر ایک تازہ ملا خشک شجر میں سے اُنھیں

یار دل مانگے نہ دوں کیوں کر کہو تو کیا کروں؟
اور اگر دے دل تو لوں کیونکر کہو تو کیا کروں؟
حضرتِ دل عشق کے رستے سے ہیں واقف نہیں
کس طرف جاؤں چلوں کیوں کر کہو تو کیا کروں؟
اپنا احوالِ محبت سامنے اس کے ظفرؔ
آپ میں لکھ کر پڑھوں کیوں کر کہو تو کیا کروں؟

کیا کہوں میں کس نشے میں رات دن مخمور ہوں
ایسی کیفیت میں ہوں اپنی خودی سے دور ہوں
خلق اپنے مُنہ سے جو کچھ مجھ کو کہتی ہے کہے
بندۂ غیور ہوں اس بات پہ مغرور ہوں

جی دھڑکتا ہے نکل جائے نہ مُنہ سے حرفِ راز
یار سب ہوشیار ہیں اور میں نشے میں چُور ہوں
جلوہ گر ہے، شمع حسن یار دل میں اے ظفرؔ
صورتِ فانوس گویا نور سے معمور ہوں

جن گلیوں میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگانِ بن سُونی پڑیں وہ گلیاں تھیں
ایسی اُنکھیاں میچے پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکتے
جن کی چالیں البیلی اور چلنے میں چھل بلیاں تھیں
خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں
تلخی اُٹھائی موت کے چکھے، خاک سب ان کو چاٹ گئی
جن کی باتیں میٹھی میٹھی مصری کی سی ڈلیاں تھیں

خوب ڈھونڈا خوب دیکھا کچھ نظر آیا نہیں
آج تک اپنے میں ہم نے آپ کو پایا نہیں
چشم ظاہر بیں سے تو دیکھا نہیں جاتا ہے یار
تم نے بھی اے دل کی آنکھوں اس کو دِکھلایا نہیں
میرے نزدیک اس نے پایا کیا محبت کا مزا
زخمِ تیغِ عشق جس نے اے ظفرؔ کھایا نہیں

ہزاروں رنج و غم ہیں خانۂ دل میں نہیں کھلتا
کہ صاحب خانہ ان میں کتنے اور مہمان کتنے ہیں
بظاہر سب ہیں انساں لیک باطن کی خدا جانے
کہ ہیں انسان ان میں کتنے اور حیوان کتنے ہیں
سمجھنا عشق کو آفت اور اس آفت میں پھنس جانا
غرض دانا بھی ہم کتنے ہیں اور نادان کتنے ہیں
مجھے شکوہ نہیں اس کے ستم کا کوئی کیا جانے
کہ اس میں لطف اس کے کتنے اور احسان کتنے ہیں

بھری ہے دل میں جو حسرت کہوں تو کس سے کہوں
سُنے یہ کون مصیبت کہوں تو کس سے کہوں
رہا ہے تو ہی تو غم خوار اے دلِ غمگیں
ترے سوا غمِ فرقت کہوں تو کس سے کہوں
نہ مجھ کو کہنے کی طاقت کہوں تو کیا احوال
نہ اس کو سُننے کی فرصت کہوں تو کس سے کہوں
کسی کو دیکھتا اپنا نہیں حقیقت میں
ظفرؔ میں اپنی مصیبت کہوں تو کس سے کہوں

برنگِ چاک گریبانِ صبح اے جرّاح
ہمارے چاک جگر کو غرض رفو سے نہیں

شگفتگی کی ہوس سے بھرا ہے ہر غنچہ دل اس چمن میں کوئی خالی آرزو سے نہیں

ظفر اس اپنے تصور کے جائیے قرباں

سرکتی یار کی تصویر روبرو سے نہیں

خواب میں جو نظر آیا وہی بیداری میں فرق مطلق نہ رہا غفلت و ہشیاری میں

کون منت کش شمشیر اجل ہو قاتل طاق تیرا خم ابرو بھی ہے خونخواری میں

زہد و تقویٰ یہ تجھی کو ہو مبارک زاہد

خوب گزرے ہے مری مستی و میخواری میں

ظفر شعر و سخن سے راز دل کیوں کر نہ ہو ظاہر

کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

ناقوس و جرس میں ہے نہ یہ نالۂ نے میں

آوازۂ حق ہے تو کسی اور ہی لے میں

کچھ دیدۂ دل ہی میں نہیں یار سمایا

وہ جان ہے اور جان ہے ساری رگ و پے میں

نہ دیکھا دہر میں تو کیا حرم میں دیکھے گا

وہ تیرے پیش نظر واں نہیں تو یاں بھی نہیں

کر نظارۂ گلزار جہاں اے غافل
پھر میسر یہ تماشہ کبھی ہونے کا نہیں

وہ دل کیا ہے نہ ہو پیکان جس میں ، وہ گھر کیا ہے نہ ہو مہمان جس میں
نہیں مطلب ہمیں حور و پری سے ، وہ انساں ہو کہ ہو اک آن جس میں
ہمارا دل عجب حسرت کدہ ہے
بھرے ہیں سیکڑوں ارمان جس میں

نہ جب تک خو تری اے کج نگہ اُلٹی سے سیدھی ہو
کہاں برگشتہ بختوں کی نگہ اُلٹی سے سیدھی ہو
ظفرؔ تقدیر سیدھی جس کی ہو اس کی عنایت سے
کرے وہ بات اُلٹی جس جگہ اُلٹی سے سیدھی ہو

واہ واتم کھاؤ غیروں کے نصیبوں کی قسم ، اے زہے تقدیر گر تقدیر ہو ایسی تو ہو
دیدہ در بندِ ہوس ہے دل ہے پابند ہوا ، قفل ہو ایسا تو ہو زنجیر ہو ایسی تو ہو
غفلتِ دنیا کا ثمرہ دیکھا عقبیٰ میں ظفرؔ ، خواب ہو ایسا تو ہو تعبیر ہو ایسی تو ہو

رونا میرا پوچھتے ہو کیا آنکھ سے آنسو بہنے دو
مجھ کو تصوّر اور بندھا ہے ایک ذرا چپ رہنے دو!

کیا رنگ دکھاتی ہے یہ چشمِ تر او ہو ہو	خونِ جگر آ ہا ہا، لختِ جگر او ہو ہو
کیا شور شرابہ ہے مے خانۂ عالم میں	ہر دم اِدھر آ ہا ہا، ہر دم اُدھر او ہو ہو
ہستی سے عدم تک ہم مر مر کے پہنچتے ہیں	اک دم کی مسافت پر اتنا سفر او ہو ہو

غفلت کا ظفرؔ پردہ اُٹھ جائے جو آنکھوں سے
آجائے تماشہ پھر کیا کیا نظر او ہو ہو

وہ مری جاں مرے پاس آئے تو کیا اچھا ہو
اور نہیں جان نکل جائے تو کیا اچھا ہو
نہیں معلوم کہ میں کون ہوں اچھا کہ بُرا
کوئی اس بھید کو بتلائے تو کیا اچھا ہو
ساغرِ جم میں جو آتی تھی نظر کیفیت
وہ نظر دل ہی میں آجائے تو کیا اچھا ہو

ایسا ہو گر کلام نہ ہو کچھ نہ کچھ تو ہو	تسکینِ دل تمام نہ ہو کچھ نہ کچھ تو ہو
جا سکتا کوئی اس بُتِ خودکام تک نہیں	جائے تو کیونکہ کام نہ ہو کچھ نہ کچھ تو ہو

وہ کون ہو سوا ترے دیوانے کے جسے
پروائے ننگ و نام نہ ہو، کچھ نہ کچھ تو ہو

رسمِ اُلفت نہ عدوئے دل و دیں سے پوچھو	دوستو اس کو جو پوچھو تو ہمیں سے پوچھو

روشِ نقشِ قدم خاک میں ملنے کا مزا
اپنے کوچے کے کسی خاک نشیں سے پوچھو

مجھ سے کیا پوچھتے ہو تم سببِ سوزشِ عشق
اک ذرا اپنے ہی حُسنِ نمکیں سے پوچھو

دل کو ازبر ہیں محبت کے مطالب سارے
بے تکلف یہ بتائے گا کہیں سے پوچھو

محبت چاہیے باہم ہمیں بھی ہو تمہیں بھی ہو
خوشی ہو اس میں یا ہو غم ہمیں بھی ہو تمہیں بھی ہو

ہم اپنا عشق چمکائیں تم اپنا حُسن چمکاؤ
کہ حیراں دیکھ کر عالم ہمیں بھی ہو تمہیں بھی ہو

ہمیشہ چاہتا ہے دل کہ مل کر کیجے مے نوشی
میسّر جام ہے جم جم ہمیں بھی ہو تمہیں بھی ہو

غنیمت تم اسے سمجھو کہ اس غم خانے میں یارو
نصیب اک دم دلِ خرّم ہمیں بھی ہو تمہیں بھی ہو

نہ ہم خوش نے خفا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو
غرض کیا کام کیا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو

زباں میں ہو اثر تیری تو شاید دل پھرے اس سے
اگر ناصح دعا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو

بغیر از جاں نثاری کب کرے ہے یار دل داری
جو اس پر مبتلا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو

بہار آئی اسیرانِ قفس آپس میں کہتے ہیں
پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

چمن میں ابر و مُل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
نشے میں رشکِ گُل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
کنارِ آب ہو مہتاب ہو ساغر ہو مینا ہو
جو یہ سامان کُل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
پڑا دریا میں ہو عکسِ چراغاں اور وُہ مہوش
کھڑا بالائے پُل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
پئیں مے اس قدر باہم نشہ کا ہو وے یہ عالم
حیا کا اپنے قُلُ ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
ہوا ٹھنڈی ہو آدھی رات ہو یا وُہ ہو یا ہم ہوں
چراغ اس وقت گُل ہو پھر تو چہلیں ہو تماشہ ہو
وہ ہوں کیلوں کی اوجھل میں اکیلے اور میں جا پہنچوں
ظفر کیا کیا نہ غُل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو

بے تابی و زاری کی شکایت ہے عبث اب
ہوتا ہے ظفر عشق کے حالات میں سب کچھ

دیتی ہے نکلنے یہ کوئی کشتیٔ مقصود　　ہے ایک بلا گردشِ گرداب زمانہ
کیا سیر کرے کوئی کہ جوں سبزۂ شمشیر　　ہے تشنۂ خون سبزۂ سیراب زمانہ
ہو کیوں کہ کسی سے ظفرؔ امیدِ محبت
ہم جانتے ہیں جیسے ہیں احباب زمانہ

نہیں اے ہمدمو چلتا یہ دم آہستہ آہستہ
رواں ہے کارواں سوئے عدم آہستہ آہستہ
شبِ فرقت میں اس کے مجھ کو مثلِ شمع سرتاپا
گھلاوے گا یہ میرا سوزِ غم آہستہ آہستہ
جواب ایسا وہ دیتے ہیں کہ کھل جاتا ہے سب مطلب
اگر کچھ کان میں کہتے ہیں ہم آہستہ آہستہ
نہیں رہنے کا دل میں باقی خوں کا ایک قطرہ بھی
بہا دے گی ظفرؔ سب چشمِ نم آہستہ آہستہ

جب تلک دم ہے رہیں گے یوں ہی غم ساتھ کے ساتھ
دیکھنا جائیں گے غم اور یہ دم ساتھ کے ساتھ

منزلِ عشق بہت دور ہے اللہ اللہ!　　ایک ہی گام میں تم تھک کے ظفرؔ بیٹھ گئے

اسے لاؤں میں نہ ہوں چشم تر نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے
جو وہ آوے ہیں نہ کروں نظر نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے
مری اور اس کی اب تلک یہ موافقت ہے کہ کیا کہوں
پھرے وہ اِدھر رہوں ہیں اُدھر نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

کیا کہوں کیونکر تجھے رشکِ قمر دیکھا کیے
وہ نظر آئے نہ جن کو بھر نظر دیکھا کیے
آہ آتشِ یار سے دل اور جگر جلتے رہے
ہائے تم اے مردمانِ چشمِ تر دیکھا کیے
گر نہیں ہے ربط کچھ باہم تو پھر محفل میں شب
تم انھیں اور وہ تمھیں کیوں اے ظفر دیکھا کیے

بولے کہ کہیں گم نہ کریں راہ مسافر
اک شخص نے کل میری کہانی جو بیاں کی
سچ ہے کہ وہی جانے ہے جس شخص پہ گذرے
اس بت کو خبر کیا ہے مرے دردِ نہاں کی
پائی نہ کسی گل میں ظفر بوئے محبت
جوں بادِ صبا گرچہ بہت سیرِ جہاں کی

ہم ایسے سوزِ غمِ ہجرِ یار سے ہیں بنے
کہ داغ دل کے گلِ نوبہار سے ہیں بنے
کریں گے ذبح ہمیں دلبرانِ کافرکیش
ازل سے ہم تو انھیں کے شکار سی ہیں بنے
جدا ہوں حسرت و اندوہ کس طرح ہم سے
کہ گنجِ غم میں یہی اپنے یار سے ہیں بنے
وہ میرے دشمنِ جاں ہیں یہ جان لیجئے گا
تمھارے آن کے جو دوستدار سے ہیں بنے

ہوتے ہوتے چشم سے آج اشکباری رہ گئی
آبرو بارے تری ابرِ بہاری رہ گئی

آتے آتے اِس طرف اُن کی سواری رہ گئی
دل کی دل میں آرزوئے جاں نثاری رہ گئی

ہوگیا جس دن سے اپنے دل پہ اس کو اختیار
اختیار اپنا گیا، بے اختیاری رہ گئی

کھنچتے ہی تیغِ ادا کے دم ہوا اپنا ہُوا
آہ دل میں آرزوئے زخم کاری رہ گئی

اور تو غمخوار سارے کر چکے غمخوارگی
اَب فقط ہے ایک غم کی غمگساری رہ گئی

عِشق میں کیا ہم ہی اسے تقدیر سیدھے ہوگئے
کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہوگئے

میری سیدھی بات پر ہوتے ہیں ٹیڑھے اے ظفرؔ
جبکہ ٹیڑھی میں نے کی تقریر سیدھے ہوگئے

اگر غفلت کا ہم پردہ اُٹھاتے اپنی آنکھوں سے
تو جو واں دیکھتے یاں دیکھ جاتے اپنی آنکھوں سے

ظفرؔ گریہ ہمارا کچھ نہ کچھ تاثیر رکھتا ہے
اُنھیں ہم دیکھتے ہیں مسکراتے اپنی آنکھوں سے

جہاں میں ہم تو غم آلودہ اک جہاں کے رہے
رہے اسی میں یہاں کے رہے نہ واں کے رہے
پہنچ گئے سرِ منزل تو ہم سفر اور ہم
بھٹکتے گرد صفت پیچھے کارواں کے رہے

چلا محفل سے کس کو چھوڑ کر بیتاب تو ایسا
کہ شعلہ شمع کا اے زیبِ محفل ہاتھ ملتا ہے
رکھا ہے عشق میں اس راہ پر ہم نے قدم اپنا
کہ جس رہ میں خضر سا میرِ منزل ہاتھ ملتا ہے

جب کوئی کہتا ہے ہستی کو کہ ہستی خوب ہے
اس کی غفلت پر فنا اس وقت ہنستی خوب ہے
توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جامِ شراب
مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے
ملک دنیا کی تو آبادی ہے ویرانہ تمام
اور بستی ہے جہاں اک خلق بستی خوب ہے

دل ہی سے پوچھو عشق میں جو دل پہ بن گئی
بسمل ہی جانتا ہے جو بسمل پہ بن گئی
پہنچی نہ رفتگانِ عدم کی جو کچھ خبر
کیا جانے کیسی جاتے ہی منزل پہ بن گئی

ہستی کے باغباں کی ظفر پوچھتا ہی کیا   جو کچھ چمن میں جانِ عنادل پہ بن گئی

ہم بتوں کو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائیں گے
پر بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائیں گے
ہاں مدد کر جذبۂ اُلفت وہ دیکھیں کب تلک
آپ کو دور اپنے اس سائل سے کھینچے جائیں گے
ایک نقشہ ان کے کاشانے کا کھینچا جائے گا
سیکڑوں نقشے مہ کامل سے کھینچے جائیں گے

کہاں خلقت عزیز و زیرِ چرخ پیر پھرتی ہے
یہ فانوس خیالی ہیں ہر اک تصویر پھرتی ہے
ظفر کو منزلِ مقصود پر تقدیر لے پہنچی
کدھر بھٹکی ہوئی سی عقلِ بے تدبیر پھرتی ہے

عقل پر ناز ہے قدرت پہ نظر کس کو ہے
سب کو فکر آج کی ہے کل کی خبر کس کو ہے
دیکھ ہر غنچہ لئے دوش پہ ہے رختِ سفر
اس گلستاں سے نہیں عزمِ سفر کس کو ہے

اللہ اللہ رے درازی شبِ ہجراں تیری
صبح محشر تلک اُمید سحر کس کو ہے
دیکھتا عیب و ہنر اور کا ہے سب کوئی
اپنا معلوم ظفرؔ عیب و ہنر کس کو ہے

رونق گلشن بہارِ گل جو کم ہوتی چلی
اشک شبنم سے نسیم صبح دم روتی چلی
ہو چکے دن ضبط گریہ کے کہ پی جاتے تھے اشک
اب تو چشمِ تر ظفرؔ کچھ آبرو کھوتی چلی

نکلنا دل سے اس پیکاں کا مشکل ہے تو بس یہ ہے
میری جاں ہے تو بس یہ ہے میرا دل ہے تو بس یہ ہے
جو قصدِ منزل مقصود ہے تو عشق پیدا کر
کہ اس منزل میں اے دل میرِ منزل ہے تو بس یہ ہے
کنارے گور کے جب عشق میں پہنچے تو یہ جانا
کہ اس دریائے بے پایاں کا ساحل ہے تو بس یہ ہے

جلوہ یہ اس نے دکھایا مرا جی جانتا ہے ۔۔۔ کہ خدا ہی نظر آیا مرا جی جانتا ہے
اُٹھ گئی میری زباں پہ سے جہاں کی لذت ۔۔۔ جو مزا عشق میں پایا مرا جی جانتا ہے

یا تو وہ جانتا ہے جو ہے مرے جی کا خیال   اور یا بارے خدا یا مرا جی جانتا ہے

اے ظفر اس گلِ خنداں کی محبّت نے تجھے
دم بدم جیسا رلایا مرا جی جانتا ہے

شمشیرِ برہنہ مانگ غضب بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
جُوڑے کی گُندھاوٹ قہرِ خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہے

ہر بات میں اس کی گرمی ہے ہر ناز میں اس کے شوخی ہے
قامت ہے قیامت چال پری چلنے میں پھڑک پھر ویسی ہے

محرم ہے حبابِ آبِ رواں سُورج کی کرن ہے اس پہ نپٹ
جالی کی کُرتی ہے وہ بلا گوٹے کی دھنک پھر ویسی ہے

وُہ گائے تو آفت لائے ہے ہر تال میں لیوے جان نکال
ناچ اس کا اٹھائے سو فتنہ گھُنگھرو کی جھنک پھر ویسی ہے

بزم اَور ہے یار اَور ہیں دَور اَور ہی ہیں گے   وُہ یار نہیں بزم میں اور اَور ہی ہیں گے
بے مہری اک انداز ہے کس کا نہیں شکوہ   اس قاتلِ سفّاک کے جور اَور ہی ہیں گے
کب سُنتے ہو تم غور سے احوال ہمارا   اس حال پہ جو کرتے ہیں غور اَور ہی ہیں گے

کیا جانتا ہے کوئی ظفر شیوۂ خوباں
ان لوگوں کے طرز اَور ہیں طور اَور ہی ہیں گے

نامہ بر سے پہلے میرا نام سُن کر ہنس پڑے
پھر سُنا پیغام تو پیغام سُن کر ہنس پڑے
بزم میں بہکی زباں ساقی کی کچھ اس لُطف سے
جام و مینا سے مئے گلفام سُن کر ہنس پڑے
یہ غرورِ جاہ غافل وہ ہنسی کی بات ہے
خاک میں جم گور میں بہرام سُن کر ہنس پڑے

کون دل سوختہ سرگرمِ فغاں ہوتا ہے
روز کیسا تیرے کوچے میں دُھواں ہوتا ہے
صدقے اس پیکِ تصوّر کے نہ ہوں میں کیونکر
یہ وہیں پہونچتا ہے یار جہاں ہوتا ہے
روکنا چاہیئے اشکوں کو محبّت میں ظفر
ورنہ جو رازِ نہاں ہے وہ عیاں ہوتا ہے

سزا ہوگی گر مجھ کو جُرمِ وفا پر
تو اے دل تجھے ہوگی تعزیر پہلے
مرا دل تو دیوانہ پیچھے بنا ہے
بنی تھی تری زُلف زنجیر پہلے

رنج و قلق ہے درد و الم ہے حسرت ہے ناکامی ہے
دوری میں اس راحتِ جاں کی کیا کیا بے آرامی ہے
ہر غنچہ و گُل ہے شکلِ دہاں گُل برگ نہیں گویا ہے زباں
ہوتی یہ چمن میں کس کی بیاں توصیفِ سمن اندامی ہے

آہ و فغاں کے ساتھ دُھواں سا ہر دم مُنہ سے نکلے ہے
دل تو جل کر خاک ہوا پر اب بھی جگر میں خامی ہے
کس کی حمایت ڈھونڈیں ہم اور کس سے مدد ہم چاہیں ظفرؔ
رکھتے نظر ہیں اپنی خدا پر وہ ہی ہمارا حامی ہے

کیا کچھ نہ کیا اور ہیں کیا کچھ نہیں کرتے
کچھ کرتے ہیں ایسا بخدا کچھ نہیں کرتے
اپنے مرضِ غم کا حکیم اور کوئی ہے
ہم اور طبیبوں کی دوا کچھ نہیں کرتے
کرتے ہیں وہ اس طرح ظفرؔ دل پہ جفائیں
ظاہر میں یہ جانو کہ جفا کچھ نہیں کرتے

نہ ہنسو دیکھ کے تدبیر کو پلٹے کھاتے
دیر لگتی نہیں تقدیر کو پلٹے کھاتے
دل کو دیکھو مرے بیتاب نہ دیکھا ہوگا
تہہ خنجر کسی نخچیر کو پلٹے کھاتے
بختِ برگشتۂ عاشق نے دکھایا پلٹا
عمر گزری فلکِ پیر کو پلٹے کھاتے
اے ظفرؔ اس سے نہ کر بات کہ دیکھا سو بار
ہم نے اس یار کی تقریر کو پلٹے کھاتے

دل میں سو فکر و خیالات ہیں اور کچھ بھی نہیں
اس کو معمورہ کہے کوئی کہ ویرانہ کہے ؟
اے ظفرؔ چاہیئے انسان کو کہے ایسی بات
کہ بُرا بھی نہ کہے کوئی مگر اچھا نہ کہے ؟

جام ہے شیشہ ہے ساقی بھی ہے برسات بھی ہے
ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے

کچھ تو ہے اپنی طرف سے طلبِ ساغرِ مے
اور ساقی کی کچھ اِمداد و مدارات بھی ہے

شیشہ خالی ہو تو خُم پاس دھرا ہے لبریز
خُم جو خالی ہو تو نزدیک خرابات بھی ہے

جوشش مستی بھی ہے ہنگامِ ہم آغوشی بھی
خواہشِ وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی ہے

سازو مُطرب بجا ہے اور نغمہ بھی ہے رقص بھی ہے
ساتھ ہر تار کے آنکھوں سے اشارات بھی ہے

وُہ بھی سر مست ہے اور ہم بھی نشے میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لُطف و عنایات بھی ہے

یار ہے یار کے ساتھ ظفرؔ بوس و کنار
اور اگر چاہیئے کچھ بات تو وہ بات بھی ہے

اپنے مرنے کا غم نہیں لیکن　　ہائے تجھ سے جدائی ہوتی ہے

کسی پردہ نشیں کا ہے شوق لگا کوئی طرح اب ایسی بتا دے مجھے
کہ اُٹھا کے وہ پردۂ شرم و حیا ذرا اپنا جمال دکھا دے مجھے

ترے دیکھنے کے تو ہیں سیکڑوں ڈھب نہیں دیکھتا ہوں تو یہی ہے سبب
کہ تجلیِ حسن سے برقِ غضب کہیں ایسا نہ ہو کہ جلا دے مجھے

رہی اتنی بھی طاقت و تاب نہیں کہ زمیں سے اب اُٹھے یہ خاک نشیں
ترے کوچے کی سمت بلا سے کہیں مرا گریۂ شوق بہا دے مجھے

لگے بات کا میری ٹھکانا کہاں کہ جب ایک سخن میں وہ سحرِ زباں
کبھی عرش بریں پہ چڑھا دے مجھے کبھی فرش زمیں پہ گرا دے مجھے

نہ ہو دامِ علائقِ جسم اگر، کروں عالمِ قدس کی سیر ظفرؔ
کوئی ایسا ہو کاملِ پاک نظر کہ جو قید ہے اس سے چھڑا دے مجھے

خاک داں ہے یہ جہانِ گزراں وہ کہ جہاں
ہیں بہت چھان رہے خاک بہت چھان گئے

بوالہوس عشق کا دم بھرتے تھے لیکن اس نے
امتحاں کا جو لیا نام تو اوسان گئے

ساکنِ کنجِ عدم مسکنِ ہستی میں ظفرؔ
آئے یوں جیسے کہ دو دن کہیں مہمان گئے

ظفرؔ کیا پوچھتا ہے راہ مجھ سے اس کے ملنے کی
ارادہ ہو اگر تیرا تو ہر جانب سے رستہ ہے

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی، جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر قرار بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
اب کی جو راہِ محبت میں اُٹھائی تکلیف سخت ہوتی ہمیں منزل کبھی ایسی تو نہ تھی
نگہِ یار کو اب کیوں ہے تغافل اے دل وہ ترے حال سے غافل کبھی ایسی تو نہ تھی

پاسِ خاطر تھا اسیری میں ہمیں صیاد کا
ورنہ ہوتا دام سو ٹکڑے اگر پر مارتے

گُل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے
وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کُمھلا کے جھڑ پڑے
کیسی ہوا چلی چمن دل میں اے ظفر
سب برگ و بار نخلِ تمنا کے جھڑ پڑے

ہے تو گردش چرخ کی بھی فتنہ انگیزی میں طاق
تیری چشمِ فتنہ زا کی ایک گردش اور ہے
بُت پرستی جس سے ہووے حق پرستی اے ظفر
کیا کہوں تجھ سے کہ وہ طرزِ پرستش اَور ہے

سوزشِ عشق میں آنکھوں سے رواں ہیں آنسو
عین گرمی بھی مرے واسطے برسات سی ہے

کوئی ہوشیار نہیں جو ہے وہ سرمست و خراب
بزمِ دُنیا عجب اک بزمِ خرابات سی ہے

ترا دیوانہ مجنوں سے سوا مشہور عالم ہے مگر مُردہ پرستی شیوۂ دستورِ عالم ہے
وہ عالم میں ہے پر عالم سے ہے اس کا جدا عالم اُسے کب پا سکے عالم یہ کب مقدورِ عالم ہے
ستم ہے یہ کہ وہ شوخ ستم گر اس ستم پر بھی پسندِ خلق مقبولِ جہاں منظورِ عالم ہے

صحبتِ گُل ہے فقط بُلبُل سے کیا بگڑی ہوئی
آج کل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی
دل شکستوں کا سخن کیونکر نہ ہووے نادرست
ساز بگڑے ہے تو نکلے ہے صدا بگڑی ہوئی
ہیں سبھی باتیں بناتے پر ہیں قائل اس کے ہم
اے ظفرؔ جو بات دے کوئی بنا بگڑی ہوئی

ہے یہ ڈر دل کو نہ چشمِ مست مہ وش کھینچ لے
اپنے مشرب میں نہ اس صوفی کو مے کش کھینچ لے
شمع کی جاذبِ محبت میں نہ ہووے گر اثر
کون پروانے کو پھر یوں سوئے آتش کھینچ لے

تراجس دن سے عالم میں نے دیکھا
مجھے بھی دیکھنے عالم لگا ہے

محفل سے تیری اُٹھ کے جو ہم صبح دم چلے
مانند شمع داغ بہ دل چشم نم چلے
دیوانے تیرے قید سے ہستی کی چھوٹ کر
کیا با فراغ جانب کوئے عدم چلے
کیا جانے راہِ عشق کی تکلیف بوالہوس
معلوم ہو جو ساتھ مرے دو قدم چلے

نہ ہو سکتے بیاں ظلم و ستم بسمل سے قاتل کے
کھلے جوہر زبانِ خنجرِ قاتل سے قاتل کے
کوئی ہے چھوٹنا آساں قیامت تک نہ چھوٹے گا
کہ پہنچا خوں مرا دامن تلک مشکل سے قاتل کے

گئی نہ سوزشِ دل اشک کے بہانے سے
بجھی نہ آگ پڑا گو اجاغ میں پانی
ظفر ہزار میکدے سے بہتر ہے
اگر نصیب ہو کنجِ فراغ میں پانی

نہ دائم غم ہے نے عشرت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے
تبدّل یاں ہے ہر ساعت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے
گریباں چاک ہوں گا ہے اُڑاتا خاک ہوں گا ہے
لئے پھرتی مجھے وحشت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

جو شکلِ شیشہ گریاں ہوں تو مثلِ جام خنداں ہوں
یہی ہے یاں کی کیفیت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

کسی وقت اشک ہیں جاری، کسی وقت آہ و زاری
غرض حالِ غمِ فرقت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

کوئی دن ہے بہارِ گل، پھر آخر ہے خزاں بالکل
چمن ہے منزلِ عبرت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

ظفر ایک بات پہ دائم وہ ہووے کس طرح قائم
جو اپنی پھیرتا نیت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

دیکھو تو آہ شیوہ یہ آدمی میں کیا ہے — حال اس کا غم میں کیا ہے اور بے غمی میں کیا ہے
خوں ہو کے بہہ چلا دل آنکھوں کی راہ شاید — سرخی سے آنسوؤں کی دیکھو نمی میں کیا ہے
دونوں ہیں یاں ہم کو یکساں جانے بلا ہماری — افسردگی میں کیا ہے اور خرمی میں کیا ہے

عیب و ہنر نہ پوچھو تم آدمی میں کیا ہے
تم میں کبھی کچھ نہ کچھ ہے پیارے ہمیں میں کیا ہے

ہیں خاک سے نکلتے رنگیں ہزارہا گل
کیا جانے یہ دفینہ یارب زمیں میں کیا ہے

دل اپنا لگ گیا کُنجِ قفس میں اب کسے پروا
بہار آئے چمن میں ہم صفیرو یا خزاں آئے
ظفرؔ سلطان سے بھی گردش زدوں کے چاہئے بچنا
کہ ہم گردش میں آئے جب سے زیرِ آسماں آئے

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

ستم کرتا ہے بے مہری سے کیا کیا آسماں پیہم
دل اس کے ہاتھ سے پُر درد ہے اور چشم ہے پرنم
کروں گا پر نہ شکوہ گرچہ ہوں گے لاکھ غم پر غم
کہے جاؤں گا میں ہر دم یہی جب تک ہے دم میں دم
خدا دارم چہ غم دارم، خدا دارم چہ غم دارم

فلک کے ہاتھ سے کیا کیا مرا دل رنج سہتا ہے
کہ اک اشکوں کا دریا چشم سے دن رات بہتا ہے
نہیں فرصت ذرا غم سے اسی میں غرق رہتا ہے
مگر تائیدِ حق پر جب نظر کرتا ہے کہتا ہے
خدا دارم چہ غم دارم ۔ خدا دارم چہ غم دارم

بلا سے گر نہیں کوئی رفیق و آشنا میرا
خدا پہ دھیان ہے میرا نگہباں ہے خدا میرا

خدا آساں کرے گا گو ہے مشکل مُدّعا میرا
خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکل کُشا میرا
خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم

نہیں غمخوار کوئی کون کر سکتا ہے غمخواری
توقع جن سے یاری کی تھی وہ کرتے ہیں عیّاری
خدا سے اپنے میں رکھتا ہوں امیدِ مددگاری
زباں ہے جب تلک مُنہ میں زباں سے ہے یہی جاری
خدا دارم چہ غم دارم ۔ خدا دارم چہ غم دارم

کوئی مغرور اپنے زور پر ہے کوئی دولت پر
کوئی نازاں شکوہ و شاں پر ہے اور کوئی حشمت پر
ظفرؔ تکیہ کیا میں نے فقط اس کی عنایت پر
خوشی سے میں یہی کہتا ہوں راضی اپنی قسمت پر
خدا دارم چہ غم دارم ۔ خدا دارم چہ غم دارم

کیا پوچھتے ہو کج روی چرخِ چنبری ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستمگری
کرتا ہے خوار تر انہیں جن کو ہے برتری اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری
کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہُما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہُما

بالعکس ہیں جہاں میں جہاں تک ہیں کاروبار — شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانہ نے اختیار
ہے موسمِ بہار خزاں اور خزاں بہار — آئی نظر عجب روشِ باغِ روزگار
جو نخل پُر ثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

بادِ صبا اُڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک — ملتے ہیں دمبدم کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک — کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں گُل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطہ سے ہم کہاں — ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں — چھٹنا محال اس سے ہے جبتک ہے تن میں جاں
جو آگیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

یہ گنبدِ فلک ہے عجب طرح کا قفس — طاقت نہیں ہے نالہ کی بھی جس میں یک نفس
جنبش ہو ایک پر کی تو پر ٹوٹ جائیں دس — رہ جائے دل میں دل کی نہ کس طرح سے ہوس۔
کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ پرواز کر سکے

کیا کیا جہاں میں ہو چکے شاہانِ ذی کرم — کس کس طرح کا رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم — دارا کہاں؟ کہاں ہے سکندر؟ کہاں ہے جم
کوئی نہ یاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نہ کوئی، یہاں رہے

انتخابِ دیوان دوم

پہچانا اسے تو نے جسے دیکھا نہ بھالا — شاباش دلا اَرشدک اللہ تعالیٰ
اللہ ری تری جنبشِ مژگاں ستم کیش — اک پل میں کیے تو نے دو عالم تہ و بالا
ہر خارِ بیاباں ہے موتی سے پروتا — جب پھوٹ کے رِستا ہے مرے پاؤں کا چھالا
بازارِ محبت میں نہ دل بیچ تو اپنا — بِک جاتا ہے ساتھ اسکے ظفرؔ بیچنے والا

کُھلے ہزار درِ باغ دل کُشا لیکن — دلِ گرفتہ مرا بند ہی رہا نہ کُھلا
ہمارے درد کو کیا جانے ناصح بیدرد — کسی پہ حال بہ جز درد آشنا نہ کُھلا

ہوا پہلے ہی کام آخر ترے ناکام کا ورنہ
کسی دن اے بُتِ خود کام تیرے کام آجاتا

گرفتاری نصیبوں میں نہ ہوتی تو چمن سے میں
بھلا اس طرح کیوں صیّاد زیرِ دام آجاتا
تری دولت سے ہوتے ساقیا جمشید دوراں ہم
اگر اس دور میں ہاتھ اپنے کوئی جام آجاتا

لیے عشرت نہ تھی طالع میں اپنے ساقیا ورنہ
فلک مینا لیے پھرتا تو مہ ساغر لیے پھرتا
برنگ نالۂ زنجیر میں زنداں میں ہوں لیکن
مجھے دیوانہ پن زنداں سے ہے باہر لیے پھرتا

نشے نے بزمِ ساقی میں جو مستوں کو اُڑا مارا
لبِ ساغر پہ منہ شیشے نے دھر کر قہقہہ مارا
نہ تھا کچھ دور تو رستہ بہت اس یار کے گھر کا
مگر ہم کو ہماری ناتوانی نے تھکا مارا

اس سبب سے ہے غریبوں کو تسلّی کہ اجل نے
مفلس کو جو مارا تو نہ زردار کو چھوڑا

کیا کہوں ہے کیا بُتوں کی آشنائی میں مزا
وُہ مزا سب اس میں ہے جو ہے خدائی میں مزا

مسجد و بت خانے میں ٹکرایا سر کو بے مزا
تیرے سنگِ در پہ آیا جبہ سائی میں مزا
جا سکے گلشن تلک اُڑ کر نہ ہم بے بال و پر
ہم نے اے صیاد کیا پایا رہائی میں مزا

اپنی چشمِ مست کی گردش نہ اے ساقی دکھا
دیکھ جکّر میں ابھی جامِ شراب آجائے گا
خوب ہوگا ہاں جو سینے سے نکل جائیگا تو
چین مجھ کو اے دلِ خانہ خراب آجائے گا

جانے دو جاتا ہے گر عمرِ رواں کا قافلہ
ٹھیر جائیگا کہیں آخر کہاں تک جائے گا
دام سے صیاد مرغِ ناتواں چھوٹا تو کیا
یہ نہیں اُمید اُڑ کر آشیاں تک جائے گا

بھولے سے بھی جدھر وہ قدم پاؤں پڑ گیا
کوسوں اُدھر دلوں ہی کا ستھراؤ پڑ گیا
زہراب دے نہ تیغ نگہ کو عتاب سے
اچھا نہ ہوگا دل پہ اگر گھاؤ پڑ گیا
سلجھے گا کیوں کہ دیکھئے دل زلفِ یار سے
بے طرح اس میں اُس میں ہے اُلجھاؤ پڑ گیا
کعبے میں جو ہے شیخ وہی بت کدے میں ہے
ناحق کا تیرے دل میں یہ بھٹکاؤ پڑ گیا

بازی لگا دے عشق کی چوسر میں شوق سے
پو بارہ ہیں ظفر جو کوئی داؤ پڑ گیا

بن گئی جان پہ اور تُو نے نہ جانا ہرگز
ہائے تُو اِتنا مرے حال سے انجان بنا
کر نہ شکوہ کہ مجھے یہ دیا وہ نہ دیا
شُکر کر تو کہ دیا ہے تجھے انسان بنا

جس کو اے ساقی دکھائی تو نے اپنی چشمِ مست
پھر نہ وہ میکش کبھی منّت کشِ ساغر ہُوا

اے جواں کیا اس جوانی کا بھروسا یہ تو سوچ
تھا جو پہلے اس سے عہدِ نوجوانی کیا ہُوا
خط تو اس نے پڑھ لیا اے نامہ بر یہ تو بتا
حالِ دل میرا بیاں تجھ سے زبانی کیا ہُوا

بلا سے گریۂ شب تو ہی کچھ اثر کرتا
اگرچہ عشق میں آہِ سحر سے کچھ نہ ہُوا
شبِ وصال میں بھی میری جان کو آرام
عزیزو دردِ جدائی کے ڈر سے کچھ نہ ہُوا
نہ دوں گا دل اسے میں یہ ہمیشہ کہتا تھا
وہ آج لے ہی گیا اور ظفر سے کچھ نہ ہُوا

کیا سنے فریاد میری ہے وُہ گُل نازک دماغ
باغ میں غنچہ اگر چٹکے کہے غُل کیوں ہُوا ؟

رازِ دل جس سے کہا دوست سمجھ کر اپنا
اسے ظفرؔ ہم نے اسے جان کا دشمن دیکھا

گیا کیا کیا گزر عالم ظفرؔ آنکھوں کے آگے سے
کہیں کیا ہم نے جو یاں مثلِ چشم نقش پا دیکھا

مری نگہ نے مرا راز کہہ دیا اس سے
بلا سے گر نہ کہا میں نے مدّعا نہ کہا
ہم اس کی بات کے قائل ہیں اے ظفرؔ جس نے
بھلا کہا جسے منہ سے اُسے بُرا نہ کہا

وفا کی راہ تھی مشکل اسے بھی طے کیا ہم نے
کہ منزل میں محبت کی اگر ڈر تھا تو اس جا تھا
گئے دُنیا سے جب شاہ و گدا دونوں ہوئے یکساں
کہ کوئی صاحبِ زر کوئی بے زر تھا تو اس جا تھا

یاں آئے کہاں سے ہیں کہاں جائیں گے یاں سے
حیراں ہیں ظفرؔ ہم یہ معمّا نہیں کھلتا

ہم نشیں ہونا غمِ اُلفت میں جو تھا سو ہُوا
شکوہ بے جا ہے مری قسمت میں جو تھا سو ہُوا
کب ہُوا تقدیر سے حاصل ظفرؔ مقصودِ دل
اے نکو نیت تری نیت میں جو تھا سو ہُوا

دل سے اک نالۂ موزوں کو جہاں کھینچ لیا — نقشۂ قد ترا اے سرو رواں کھینچ لیا
پاؤں آرام سے پھیلائے اسی نے اپنے — ہاتھ دنیا سے ظفر جس نے یہاں کھینچ لیا

شرمگیں کیا کیا ہوا تیرا شہاب اس دم کہ جب
نالہ زیرِ آسماں سیدھا سا کھینچ کر رہ گیا

جب مُنہ آ کر قریں وہ زیبِ محفل پھر گیا — محفلِ عیش و طرب سے بس برا دل پھر گیا
بوالہوس آیا تھا میرے ساتھ راہِ عشق میں — اے ظفر دیکھی جو اُس نے سخت منزل پھر گیا

جس کو کہ ڈھونڈتا ہوا میں ہر کہیں گیا — دل ہی میں تھا مرے وہ مجھے مل یہیں گیا
چونکا نہ خواب گاہ میں شب بھی وہ مستِ ناز — شور و فغاں مرا سرِ چرخِ بریں گیا

خانۂ زنداں میں میرے نالۂ زنجیر سے — شورِ محشر سے بھی اک برپا ہوا غل ہو گیا
تجھ کو کیا تیری بلا سے کوئی اے غفلت شعار — ہو گیا گر کشتۂ تیغِ تغافل ہو گیا

سینے میں اک دھواں کئی بار اُٹھ کے رہ گیا — نکلا نہ میرے دل کا بخار اُٹھ کے رہ گیا
آیا نہ میرے دیدۂ گریاں کے سامنے — سو بار دیکھا ابرِ بہار اُٹھ کے رہ گیا
تیری گلی سے جا نہ سکا اُٹھ کے یہ نحیف — تھا ایک ناتواں سا غبار اُٹھ کے رہ گیا
پکڑے جو خارِ دشتِ جنوں نے ہمارے پاؤں — اپنا قدم ظفر سرِ خار اُٹھ کے رہ گیا

ہمدموں کا پوچھنا ہر دم مرا دم کھا گیا — کیا کہوں ہیں دم نہیں مجھ میں مجھے غم کھا گیا
ڈوبے آبِ گریہ سے تیرے فقط کہسار کیا — بلکہ غوطہ آسماں اے چشمِ پُرنم کھا گیا
چھیڑ کر تجھ کو دلِ عاشق نے کیا پایا مزا — تیرے کوڑے سفت وہ اے زلفِ پُرخم کھا گیا
گردشِ چشم اپنی دکھلائی جو اس بے مہر نے — آسماں کیا بلکہ چکر عرشِ اعظم کھا گیا

دُنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا — ہم نے یہی پایا کہ بُرا نام نہ پایا
آغازِ محبت کو تو ہاں سمجھے ہم اچھا — اچھا پر اس آغاز کا انجام نہ پایا

نہ اِس کا بھید یاری سے نہ عیّاری سے ہاتھ آیا
خدا آگاہ ہے دل کی خبرداری سے ہاتھ آیا
نہ ہوں جن کے ٹھکانے ہوش وُہ منزل کو کیا پہونچیں
کہ رستہ ہاتھ آیا جس کے ہشیاری سے ہاتھ آیا
ہوا حق میں ہمارے کیوں ستم گار آسماں اتنا
کوئی پوچھے کہ ظالم کیا ستم گاری سے ہاتھ آیا
اگر کچھ مالِ دُنیا ہاتھ بھی آیا حریصوں کے
تو دیکھا ہم نے کِس کِس ذلّت و خواری سے ہاتھ آیا

نفس کے ساتھ جو دُودِ جگر لپٹا ہُوا آیا — کبابِ سوختہ کا سا مرے مُنہ میں مزا آیا
چڑھایا جوشِ گریہ نے ہمارے اس قدر دریا — کہ گردوں بھی قطرہ پانی کا سا اک بُلبلا آیا

صد آفریں کہ مرے دل نے داغ لے تو لیا
اندھیری گور کی خاطر چراغ لے تو لیا
ہوا جو کوئی قناعت گزیں جہاں میں ظفرؔ
پھر اس نے گوشۂ امن و فراغ لے تو لیا

دیکھ میرا حال کیا سوزِ گداز عشق ہے
بزم عالم میں ہے جوں شمع سحر گاہی خراب
طفل کو راحت زیادہ ہے جوان پیر سے
چین نادانی میں بھی کرتی ہے آگاہی خراب

سرنامہ میرے نام کا اور خط رقیب کا
ظالم ترے ستم کے ہیں عنواں عجب عجب
غمزہ عجب نگاہ عجب اور ادا عجب
کچھ دل ربائیوں کے ہیں ساماں عجب عجب
وہ لوگ اس زمانے میں ہیں اے ظفرؔ کہاں
دیکھے ہوئے ہیں آپ نے انساں عجب عجب

صوفی و رند ہیں دونوں تیرے غمزے سے تباہ
خانقاہ گرچہ ہے ویراں تو خرابات خراب
وہ خدا کا ہے غضب ان کا ہے جو لطف و کرم
کرتی عاشق کو بتوں کی ہے عنایات خراب

جس کو کچھ پاس نہیں بات کا اپنی ہرگز
میرے نزدیک ظفرؔ ان کی ہے ہر بات خراب

ہوگا ظاہر یہ مرا دردِ جگر آپ سے آپ
تجھ کو ہو جائیگی بے درد خبر آپ سے آپ
ایسے غفلت کدہ میں آئے کہ ہم بھول گئے
تھے کہاں اور چلے آئے کدھر آپ سے آپ

ہیں یہاں رنج کے آثار خوشی کے باعث
اشک آنکھوں سے ٹپکتے ہیں خوشی کے باعث
تم جو غصے ہو تو غصہ مرے سر آنکھوں پر
پر بشرطیکہ نہ ہو اور کسی کے باعث

ہم سے وہ اور ہم اس سے ہیں ظفرؔ یوں باہم
موج میں آب ہو جس طرح سے اور آب میں موج

بھول جاتا راہ کعبہ کی مگر دیکھا نہیں
تو نے زاہد جلوۂ حسنِ بتاں اچھی طرح

ہو گیا یکدم مکدر دیکھو وہ آئینہ رو
حضرتِ دل تھا تمہیں جبکی صفائی پہ گھمنڈ

اُف غضب بجلی سی چمکی شب ترے رُخسار سے
دیکھتے ہی ہو گیا روئے مہ تاباں سفید

شمع کو پردۂ فانوس سے کچھ کام نہیں،
پر ترے رشک سے چھُپ جائے ہے جل کر اندر

ہمیشہ راہِ محبت میں ہے ہمیں درپیش
بہ رنگِ گردِ رہِ کارواں نشیب و فراز

دیا جواب مری عمر نے مجھے قاصد
وہاں سے خط کا نہ آیا ترے جواب ہنوز

ملانا خاک میں ہے اور بھی ہوا منظور
بڑھایا تم نے جو اس خاکسار سے اِخلاص
جہاں میں جلنے کہیں بد نصیب و بد قسمت
ظفر وہ رکھتے ہیں اس بد شعار سے اِخلاص

آتی ہے ہنسی اس کو مرے رونے پہ کیا کیا
کرتا ہے مگر شرم سے وہ غنچہ دہاں ضبط
یہ اس شہِ خوبی کا عجب ضابطہ دیکھا
کرتا ہے وہ بے جُرم و خطا دل کا مکاں ضبط

پہونچے تری شبیہ کو یوسف کی کیا شبیہ
سب اس کے خط و خال ہیں تصویر میں غلط
کیا کیا نہ ہم نے دل کی تسلی کے واسطے
طومار باندھے آہ کی تاثیر میں غلط

اُٹھا کے آنکھ نہ دیکھا چمن میں نرگس نے
رہا جو اس کو تری چشمِ پُر حیا کا لحاظ
نہ توڑ دل کو مرے اے بتانِ سنگین دل
ڈرو خدا سے کرو خانۂ خدا کا لحاظ

روشنی سوزِ محبت سے رہیگی تا حشر
ہم کو پروا نہیں گُل ہووے اگر گور کی شمع
آتشِ فرقتِ جاناں سے دلِ سرد مرا
اس طرح جلتا ہے جیسے کوئی کافور کی شمع

باغِ عالم میں مناسب ہے بشر کو احتیاط
اے ظفر چلتی ہوایاں دم بدم ہے مختلف

کب رہتی ہے دُنیا میں بہارِ گُل و گلشن
دو دن میں اُڑا دے ہے ظفر بادِ خزاں خاک

شاخِ گُل جیسے ہوا سے جھومتی ہے باغ میں
ہے ظفرؔ یوں چال میں اس تیرے متوالے کی جھوک

جو ہوتے ہم نہ جہانِ خراب میں داخل
تو ہوتے کاہے کو رنج و عذاب میں داخل

جو تیری چشم ہو بیدار دل بھی ہو بیدار
نہیں تو جاگنا تیرا ہے خواب میں داخل

بچا تھا کچھ ترے رخسار سے ازل میں نور
ہوا وہ چشمِ مہ و آفتاب میں داخل

اگرچہ جوان ہو دلِ پیر عشق کی دولت
تو اے ظفرؔ ہے وہ تیرے شباب میں داخل

یہ جو دم کی آمد و شُد ہے اسی میں اے ظفرؔ
دم بدم اک سیرِ ہستی و عدم کرتے ہیں ہم

جن کو ایمان ہم اپنا بخدا گنتے ہیں
پوچھو وہ گبر کہ مومن ہمیں کیا گنتے ہیں

تو جدھر قبلۂ جاں اپنا تصور ہے اُدھر
اس تصوّر ہی کو ہم قبلہ نما گنتے ہیں

ظلم سہتے ہیں بجز شکر نہیں کچھ کہتے
ہم جفاؤں کو تری مہر و وفا گنتے ہیں

آہ و فغاں یا نالے پیہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
تم کو کیا تنہائی میں ہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
وُہ بے پروا اُن کی بلا سے کوئی جیئے یا کوئی مرے
ظلم و ستم عشّاق پہ ہر دم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
چاک گریباں بال پریشاں ٹکڑے ٹکڑے داماں خاک بسر
اپنا جنوں کی سے ہے یہ عالم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
مجھ سے خفا کیوں میری خطا کیا ہے تو قصورِ دیدۂ و دل
مشورہ کر کے دونوں باہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں

کفر سے ایماں ملا اس مُلکِ ہستی میں ہمیں
حق پرستی ہاتھ آئی بُت پرستی میں ہمیں
اے ظفرؔ ہم نے کیے جو جو زبردستی میں کام
اُن کے بدلے مِل رہے ہیں زیردستی میں ہمیں

خوبیِ جوہر سے پاتی ہے ہر اِک شے امتیاز
لعل بھی پتھر ہی ہیں لیکن وُہ پتھّر اور ہیں

ہمیشہ رنج و غم، درد و الم، پاس اپنے رہتے ہیں
ہمیں کنجِ حُزن میں آپ کیا تنہا سمجھتے ہیں

ہم اپنا خونِ دل پیتے ہیں بشل بادۂ گلگوں
اور اپنی چشم و دل کو ساغر و مینا سمجھتے ہیں

جو لالہ ہو دستِ حنائی کے قرباں — تو ہو شوخ نازک کلائی کے قرباں
دکھاتا ہے ہر رنگ میں جلوہ اپنا — میں اس شوخ کی خودنمائی کے قرباں
وفا ہو جو تجھ میں تو کیا جانے کیا ہو — کہ دل ہے تری بیوفائی کے قرباں

چشم مست اپنی جو دکھلائے وُہ مے نوش تمہیں
زاہد و ہوش و خرد کا نہ رہے ہوش تمہیں
آنکھیں سُرمہ سے ہیں آلودہ تری پُوچھ ان سے
کس کے ماتم نے کیا ہے یہ سیہ پوش تمہیں

عالمِ صورت میں تو ہاں صورتِ آدم میں ہوں
عالم معنی میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں
مجھ سے کیوں اُلجھے ہے تو ناصح کہ ہاں اُلجھا ہُوا
آگے ہی اس کے خیالِ گیسوئے پُرخم میں ہوں
بڑھتے بڑھتے دل تلک پہونچا ظفرؔ زخمِ جگر
اور میں اب تک تلاشِ نسخۂ مرہم میں ہوں

میں ہوں عاصی کہ پُر خطا کچھ ہوں
تیرا بندہ ہوں اے خدا کچھ ہوں

جزو کل کو نہیں سمجھتا میں
دل میں تھوڑا سا جانتا کچھ ہوں

جب کہ نا آشنا ہوں میں سب سے
تب کہیں اس سے آشنا کچھ ہوں

خواب میرا ہے عین بیداری
میں تو اس میں بھی دیکھتا کچھ ہوں

تم سے الفت نباہتا ہوں میں
باوفا ہوں کہ بے وفا کچھ ہوں

گرچہ کچھ بھی نہیں ہوں میں لیکن
اس پہ بھی کچھ نہ پوچھو کیا کچھ ہوں

نہیں ہے طاقتِ جنبش مجھے تو ناتوانی سے
جو کروٹ بسترِ اندوہ پر لوں کس طرح سے لوں

خبر اپنی بھی جب مجھ کو نہ ہو رنج و مصیبت میں
دلِ آفت زدہ کی میں خبر لوں کس طرح سے لوں

مرا بختِ سیہ دیتا نہیں یہ دسترس مجھ کو
بلائیں زلف کی جو سر بسر لوں کس طرح سے لوں

پھر گئی اک بار ایسی باغِ عالم کی ہوا
بولتے وہ بولیاں بھی جانور اگلی نہیں

کہوں کیا جوشش گریہ چشم طوفاں زا کا میں اپنے
بھرے ہیں سیکڑوں جس کے سمندر ایک گوشے میں

کرے محفل میں سرگوشی وہ کیا حلقہ بگوشوں سے
غنیمت ہے جو کچھ کہہ دے بُلا کر ایک گوشے میں

یوں بہم پیوستہ بدخو یار دور رہتے نہیں
اک میاں میں جس طرح ہتھیار دو رہتے نہیں

اسلئے مجنوں کی موت آئی کہ پیدا ہم ہوئے
مُلکِ وحشت میں بہم سردار دو رہتے نہیں

کُنجِ تنہائی میں کس دم پاس اپنے اے ظفرؔ
رنج و غم یہ مونس و غمخوار دور رہتے نہیں

اے ظفرؔ یہ تیرے اشعار ہیں یا نالۂ زار
کیا بلا ہیں جو یہ یوں دل میں اثر کرتے ہیں

دُنیا کا ہے مزا ظفرؔ انجام کار زہر
میٹھا سمجھ کے لوگ اسے للچا گئے تو ہیں

نہ ہم کچھ ہنس کے سیکھے ہیں نہ ہم کچھ رو کے سیکھے ہیں
جو کچھ تھوڑا سا سیکھے ہیں کسی کے ہو کے سیکھے ہیں

جو پہلے تھے یار اپنے اب ان کو کہاں ڈھونڈیں
باقی ہے نشاں کس کا ہم کس کا نشاں ڈھونڈیں

پیری میں ظفر بہتر ہے ہمدم دیرینہ
جو لوگ جواں ہوں وہ دلدار جواں ڈھونڈیں

جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہ سوزاں کو
جگر کو سینہ کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

جگہ کس کس کو دوں دل میں ترے ہاتھوں سے اے قاتل
کٹاری کو، چھری کو، بانک کو، خنجر کو، پیکاں کو

ترے دندان ولب نے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو، لعل کو، یاقوت کو، ہیرے کو، مرجاں کو

لڑا کر آنکھ اُس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو

نہیں قُلقُل، دعا دیتا ہے شیشہ دمبدم ساقی
سبُو کو، خُم کو، مے کو، میکدے کو، مے پرستاں کو

نہ ہو جب تو ہی اے ساقی! بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو، ابر کو، گُل کو، چمن کو، صحنِ بستاں کو

بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
مَلک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

جاؤ اُس بن اگر آرام نہیں تم جانو　　حضرتِ دل ہمیں کچھ کام نہیں تم جانو
تم مسلماں ہو ظفرؔ خوب نہیں عشقِ بتاں　　اور اگر یہ ہے تو اسلام نہیں تم جانو

وہاں کی مخلصی اسے واسطے قسمت ہو تو کیوں کر ہو
کہ ہیں آلودہ عصیاں ہوں رحمت ہو تو کیوں کر ہو

واں تو کینہ ہو جفا ہو یہ بھی ہو اور وُہ بھی ہو اور کچھ نہ ہو
یاں محبت بے وفا ہو یہ بھی ہو اور وُہ بھی اور کچھ نہ ہو
جو تمہاری نرگسِ بیمار کا بیمار ہو اُس کے لئے
روز دارو ہو دعا ہو یہ بھی ہو اور وُہ بھی اور کچھ نہ ہو
یہ ستم کیا ہے کہ اے قاتل ہمارے قتل کو خنجر بکف
تیرا غمزہ ہو ادا ہو یہ بھی ہو اور وُہ بھی اور کچھ نہ ہو
وصل میں بھی کچھ نہ کچھ دھڑکا رہے ہے اے ظفرؔ کچھ ایسا ہو
یار ہو گوشہ جدا ہو یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو اور کچھ نہ ہو

یہ قصّہ وہ نہیں تم جس کو قِصّہ خواں سے سنو
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سُنو
سناؤں دردِ دِل اپنا تو دمبدم فریاد
مثالِ نے مری ہر ایک استخواں سے سُنو

جو دوست تھے وہ ہیں دشمن عجب تماشا ہے — ہوا ہے دیکھ زمانے کا حال کیسا کچھ
مرے زوال سے جانو کمال کو میرے — زوال یہ ہے تو ہوگا کمال کیسا کچھ
ظفرؔ نکالے فلک نے جو کج روی کے ڈھنگ — تو اک زمانہ ہُوا پائمال کیسا کچھ

نقش بر آب ہے ہستی کی نہیں کچھ بنیاد
اے حباب اس پہ کہاں گھر کے بنانے کی جگہ
ہے یہ انبوہ غم و رنج ہجوم حسرت
نہیں سینے میں ظفرؔ دم کے سمانے کی جگہ

جو کہ ہو تجھ سے سوا تو، اسے حسرت سے نہ دیکھ
اور جو تجھ سے ہو کم اس کو حقارت سے نہ دیکھ
دیکھ آئینہ صفت ساتھ صفائی کے ہمیں
روشِ کینہ و آئینِ کدورت سے نہ دیکھ
دیکھوں کیا گلشنِ ہستی کو کہ کہتی ہے خزاں
تو بہار اس کی بہت بیٹھ کے فرصت سے نہ دیکھ
نالِ دُنیا تجھے سو جلوہ عروسانہ دکھائے
ہے جواں مرد اگر، تو اسے رغبت سے نہ دیکھ

کون کہتا ہے کہ شوخی و شرارت سے نہ دیکھ
دل کو لیکن نظرِ دزدی و غارت سے نہ دیکھ
دیکھ تو، ہمتِ عالی سے بشر کا رتبہ
مرتبہ اس کا بلندی عمارت سے نہ دیکھ

کہاں تک یوں ہی ہر شب انجمن آرائی ہووے گی
پھر آخر ایک دن تو ہوگا اور تنہائی ہووے گی

وہ گرچہ دشمنِ صبر و قرار ہے لیکن
نہ دیکھوں جب تلک اس کو نہیں قرار مجھے
وفورِ گریہ نے میرے بچا لیا ورنہ
جلا چکی تھی مری آہ شعلہ بار مجھے
نہ بزمِ غم سے غرض ہے نہ بزمِ شادی سے
جہاں ہیں کام ہے رونے سے شمع زار مجھے

عیش سے گذری کہ غم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
نبھ گئی جو اس صنم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
دوستی اس دشمنِ جاں نے نباہی تو سہی
گو نبھی ظلم و ستم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
خوب گذری گرچہ اوروں کی نشاط و عیش میں
اپنی بھی رنج و الم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
بوئے گل کیا رہ کے کرتی گل نے رہ کر کیا کیا
وہ نسیم صبح دم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

شکر صد شکر اپنے مُنہ سے جو نکالی میں نے بات
اے ظفر اس کے کرم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

واں رسائی نہیں تو پھر کیا ہے
یہ جدائی نہیں تو پھر کیا ہے
گلہ ہوتا ہے آشنائی کا
آشنائی نہیں تو پھر کیا ہے
اللہ اللہ رے ان بُتوں کا غرور
یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہے
موت آئی تو ٹل نہیں سکتی
اور آئی نہیں تو پھر کیا ہے
نہیں رونے میں گر ظفر تاثیر
جگ ہنسائی نہیں تو پھر کیا ہے

بحرِ غم میں دست و پا اک عمر مارے جائیں گے
اِس کنارے سے کہیں تب اُس کنارے جائیں گے
کوئی حسرت اے فلک اپنی نکلنے کی نہیں
ساتھ ہی زیرِ زمیں ارمان سارے جائیں گے

کرتے ہیں ظاہر لُطف و عنایت مُنہ کے ہیں یہ میٹھے نہایت
دل میں بھرا ہے ان کے ستم یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہونگے
قول و قسم سب ان کے غلط ہیں، اپنی غرض کے یار فقط ہیں
جانتے ہیں خوب ان کو ہم، یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہونگے
کُشتہ اگر ہو تیغ جفا سے کوئی انہیں کیا اُن کی بلا سے

ان کو ظفرؔ ہے کس کا غم، یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہونگے

بلا سے گر نہیں ہے سایۂ بالِ ہما سر پر
تری دیوار کا سایہ کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے
وہ ہے پیشِ نظر اور پھر نظر آتا نہیں ہرگز
پڑا غفلت کا، اک پردا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے
ہمیں کیا کام جو ناحق سہارا غیر کا ڈھونڈیں
سہارا یاں خدا ہی کا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے
مزا جو کچھ کہ اس دردِ محبت میں ہے بے دردا!
وہ ہم سے پوچھتے ہو کیا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے
ظفرؔ دنیائے فانی خواب کا سا ایک عالم ہے
مگر اس خواب میں دیکھا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

بہکانیوالے آپ کے سب یار بن گئے
سمجھانیوالے مُفت گنہگار بن گئے
کیفیت اپنی چشمِ سیہ مست کی نہ پوچھ
صوفی تمام دیکھ کے مے خوار بن گئے
کیسی بنے گی دیکھئے کیونکر چھپے گا راز
غماز میرے دیدۂ خوں بار بن گئے
بھیجا تھا میں نے اپنی طرف سے جنہیں وہاں
جاتے ہی سب وہ اسکے طرفدار بن گئے

کیا خود بدخواہ کیا تدبیر دشمن بن گئی ـــ میرے حق میں خود مری تقدیر دشمن بن گئی
زلف مشکیں باندھتی ہے دل کی مشکیں کس لیے ـــ کیا خطا کیا جرم بے تقصیر دشمن بن گئی
اے ظفر اس وقت میں عزت ہے ذلت کا سبب ـــ صاحبِ توقیر کی توقیر دشمن بن گئی

بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزشِ غم سے
مگر منہ سے نہ اُف ہم غمگساروں میں نکالیں گے

ہزاروں عشق میں اے حضرتِ دل رنج و غم پہنچے
پر افسوس اپنے مقصد کو نہ تم پہنچے نہ ہم پہنچے
تماشا اور ہی کچھ ہم نے دیکھا ساغرِ دل میں
ظفر کیا دخل کیفیت کو اس کی جامِ جم پہنچے

ڈرتا ہوں موجِ بحرِ محبت سے اے ظفر
ہاتھ آتے آتے دامنِ ساحل ڈبو نہ دے

آدمی کہتے ہیں جن کو کم ہیں دنیا میں وہ لوگ
یوں تو سب اولادِ آدم سے یہ بستی ہے بھری
گنبدِ گردوں کو تم خالی نہ سمجھو اے ظفر
اس میں سرتاپا بلندی اور پستی ہے بھری

جاگیر میں وحشت نے دیا ہم کو جو صحرا
جانا کہ ترقی ہوئی منصب میں ہمارے
دم اس کی محبت کا بھرے جائیں گے ہر دم
جب تک کہ ظفرؔ جان ہے قالب میں ہمارے

بُرے ہیں یا بھلے ہیں اے ظفرؔ لیکن غنیمت ہیں
کہ یاں آئیں گے پھر پھر کر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

نہ جائے سوزِ دل گر جان جل جائے تو یہ جائے
نہ جائے دردِ دل گر دم نکل جائے تو یہ جائے
نہیں جانے کی جیتے جی تو حسرت وصلِ جاناں کی
مگر ہاں بعدِ مُردن اے اجل جائے تو یہ جائے
ظفرؔ کیا کیا کہے ہیں شعر اس میں واہ وا تو نے
سخن فہموں کی محفل میں غزل جائے تو یہ جائے

کیے لاکھوں ستم اس پیار میں بھی آپ نے ہم پر
خدا نخواستہ گر خشمگیں ہوتے تو کیا کرتے
خراباتِ جہاں کی سیر تو کی ہم نے رندی میں
اگر ہم زاہد خلوت گزیں ہوتے تو کیا کرتے

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
بلا یہ کون لیتا جان پر لیتے تو ہم لیتے

ہم کو کیا کام ہے ہم کون شکایت والے
کچھ کہیں یا نہ کہیں آپ کی صحبت والے
نہیں آنسو ہوئے رحمت کے فرشتے نازل
پاک بالکل ہیں گناہوں سے ندامت والے

کہاں ہیں وہ اگلی ملاقات والے
عنایات والے مدارات والے
خوش اوقات دیکھے خرابات والے
ہمیشہ رہے خوش اس اوقات والے
جو دل میں تمہارے وہ ان کی زباں پر
تمہارے ہیں عاشق کرامات والے
ہم اس کو سمجھتے ہیں جو منہ سے کہہ دو
اشارات جانیں اشارات والے

رخسار سرخ زلف سیہ فام کے تلے
پھولی ہے ایک طرفہ شفق شام کے تلے

نہ پوچھو شعلے میں یہ کس کی گرمی پائی جاتی ہے
نہ پوچھو یہ شرارے میں شرارت کس کی ملتی ہے
کہو دل سے نہ کر فریاد اس انصاف دشمن سے
کہ واں داد اے گرفتارِ محبت کس کی ملتی ہے

تجھ کو بہکا دیا کسی نے ہے
ہائے یہ کیا کیا کسی نے ہے

ہم نے دیکھا ہے جو ستم تیرا
نہیں اب تک سُنا کسی نے ہے

کیا مزے میں گذرتی تھی لیکن
کر دیا بے مزہ کسی نے ہے

اے ظفر رو دیا ہے جب میرا
کچھ سُنا ماجرا کسی نے ہے

گُل کیوں نہ کِھلے روز کہ ہاتھوں سے فلک کے
ہوتا ظفرؔ ایک سینہ فگار اور نیا ہے

تمہاری بے وفائی کا تو ڈر پہلے سے ہم کو ہے
نہیں ہم بے خبر اس کی خبر پہلے سے ہم کو ہے

کریں گی ایک دن دل سے خلش اس شوخ کی مژگاں
کہ کھٹکا ہو گیا یہ اے ظفرؔ پہلے سے ہم کو ہے

نہ تو کچھ کفر ہے نہ دیں کچھ ہے
ہے اگر تو ترا یقیں کچھ ہے

دیر و کعبے میں ڈھونڈتا کیا ہے
دیکھ دل میں کہ بس یہیں کچھ ہے

عدم میں بھی مصیبت کچھ نہ پوچھو ہائے ایسی ہے
جہاں دم مارنے کی جا نہیں واں جائے ایسی ہے

نہ پوچھو دوستوں کی اپنے حالت اپنی فرقت میں!
کہ جس کو دیکھ کر دشمن کو بھی رحم آئے، ایسی ہے

نزاکت کیا کہوں دل کی عجب نازک کلی ہے دل
سخن کی اک ذرا گرمی سے جو مرجھائے، ایسی ہے

اس نگاہ مست کے مستوں کی مستی اور ہے
اور مے ہے اور ان کی مے پرستی اور ہے
اے ظفر بستے ہیں دل میں رنج و غم درد و الم
اب تو کچھ اس خانۂ ویراں میں بستی اور ہے

نہ بدخواہوں سے کچھ ہوگا نہ ہوگا خیر خواہوں سے
جو کچھ تقدیر کی اپنی ہے گردش ہونے والی ہے
رہا گر شور زور اپنے دلِ شوریدہ کا یوں ہی
تو اک دن مثلِ شورِ حشر شورش ہونے والی ہے
بہا گر آنسوؤں کا آنکھ سے دریا تو کیا حاصل
فرد کب اس سے میرے دل کی سوزش ہونیوالی ہے
کیا اس ماہ وش سے اے فلک تو نے جدا ہم کو
نہ تھے واقف کہ تیری یوں بھی گردش ہونے والی ہے

مجھے جو یار میرے آئے ہیں سمجھانے کیا سوجھی
جو مجھ کو عشق میں سوجھی کوئی کیا جانے کیا سوجھی

وہ سب دُنیا میں ہیں جتنے مزے ہیں زندگانی کے
خدا جانے کیا کیوں ترک اسے دانا نے کیا سُوجھی
لگے ہے جب کسی سے لو تو پھر ایسی ہی سوجھی ہے
نہ پوچھو ڈھیر کیوں جل کر ہوئے پروانے کیا سُوجھی
جو اس علینک میں سوجھے ہے وُہ پوچھو می پرستوں سے
کہ جب تم نے چڑھائے بھر کے دو پیمانے کیا سُوجھی

آنے کی جی میں یاں تم کیوں ٹھانتے نہ آتے
کھینچا ہے جذبِ دل نے جب جانتے نہ آتے
ہوتا نہ عُذر تم کو گر خاک سے ہماری
دامن کو تم وہیں سے گردانتے نہ آتے
ہم سامنے تمہارے آئے تھے سادگی سے
تیور اگر تمہارے پہچانتے نہ آتے

شکر اللہ ہم سے یہ کافر صنم اچھے رہے
حق پرستو، بُت پرستی میں بھی ہم اچھے رہے
وُہ بُرا کہتے رہے ہم کو پر اُن کے عشق میں
جیسے ہم اچھے رہے ایسے بھی کم اچھے رہے

مر کے تو سب خاک ہو جائیں گے لیکن جیتے جی
جو رہے اس یار کی خاک قدم اچھّے رہے
ہم نے اس ہستی میں رہ کر وُہ اُٹھائے رنج و غم
جو روانہ ہو گئے سوئے عدم اچھّے رہے
ہے یہاں کی اشک باری رحمت باری ظفرؔ
ابر آسا جو رہے با چشم نم اچھّے رہے

رہتا زباں پہ آٹھ پہر کِس کا نام ہے؟
کرتا ہے یہ جو دل میں اثر کس کا نام ہے؟
ہم کو کِسی کے عیب و ہُنر کی خبر نہیں
کہتے ہیں عیب کِس کو ہُنر کِس کا نام ہے؟
بدنام ہے جہاں میں ظفرؔ جن کے واسطے
وہ جانتے نہیں کہ ظفرؔ کس کا نام ہے؟

ہم اس چشمِ تصوّر ہی کو اپنا جامِ جم سمجھیں
اسی میں ہم کو کیفیّت نظر بہتری آتی ہے
کیا ہے کیا فسوں تو نے کہ دل تجھ سے نہیں پھرتا
برائی دل میں اے بیداد گر بہتری آتی ہے

قطعہ

بجز خونِ دلِ محزوں بجز چشم و دلِ پُر خوں
نہ پاس اپنے مئے گُل گوں نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے
ظفرؔ مے خانۂ عالم میں ہم کو ایک مدّت سے
نہ مستی کی ہوس نے مے پرستی کی تمنّا ہے

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھریاں تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے کبھی رہتے بشریاں تھے
جہاں پھرتے بگولے ہیں اُڑاتے خاک صحرا میں
کھُلی اُڑتی تھی دولت رقص کرتے سیم بریاں تھے
ظفرؔ احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتریاں تھے

ہم رہیں ساقی رہے اور دورِ پیمانہ رہے
حشر تک یارب یونہی آباد مے خانہ رہے
جس طرح سے شمع پر پروانہ ہوتا ہے فدا
اس طرح سے شمع اس کے رُخ پہ پروانہ رہے
جس کے سر پر ہووے زیبا یار کے کوچے کی خاک
خاک اس کو آرزوئے تاجِ شاہانہ رہے

ہیں وُہ مے کش اس چمن میں ہوں کہ اے ساقی مُدام
مثلِ نرگس جس کے سر کے ساتھ پیمانہ رہے
تیغِ قاتل کا ادا کب شُکر ہوتا ہے ظفرؔ
گو لبِ ہر زخم پر بسمل کے شُکرانہ رہے

وہ دیکھ لیتے ہیں جو ادھر کچھ نہ کچھ تو ہے
ہو جاتی دل کو دل کی خبر کچھ نہ کچھ تو ہے
وحشت ہے یا جنوں مجھے پر تیرے عشق میں
پھرتا ہوں یوں جو خاک بسر کچھ نہ کچھ تو ہے
اتنے کشیدہ مجھ سے نہ ہو تم کہ آخرش
دل کی مرے کشش میں اثر کچھ نہ کچھ تو ہے

تمام عمر گذاری ہے اپنی غفلت میں
جہاں کی سیر ظفرؔ ہم نے خواب میں کی ہے

گرچہ بے طاقت ہوں میں پر دل میں طاقت اور ہے
قوتِ ظاہر سے یاں باطن کی طاقت اور ہے
ہوں دل بریاں سے میرے کس طرح ہمسر کباب
اس کی لذّت اور ہے اور اُس کی لذّت اور ہے

نازہی درپے نہیں دل کے فقط غمزہ بھی ہے
بچ سکے کیوں کر کہ اک آفت یہ آفت اور ہے

مے کدہ میرے لئے تیرے لئے ہے خانقاہ
تیرا مذہب اور زاہد میری ملّت اور ہے

اے ظفر جتنی جتاتے ہیں ہم اپنی دوستی
ہوتی اتنی ہی انھیں یاں ہم سے نفرت اور ہے

انتخاب دیوانِ سوم

کعبہ و دیر میں ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے جسے
شکرِ صد شکر کہ وہ ہم نے ظفرؔ یاں پایا

آ گیا جب زباں پہ نام ترا
پھر زباں سے مزا نہیں جاتا
محوِ حیرت ہوں صورتِ تصویر
کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا

بلا سے گر نہ ہوا دل کا داغ گُل نہ ہوا
بر اپنے گھر کا یہ روشن چراغ گُل نہ ہوا
کیا ہزار شگفتہ بہار نے لیکن
خزاں کے ڈر سے کبھی بافراغ گُل نہ ہوا

کوئی صنم اسے سمجھا کوئی خدا سمجھا
نہ سمجھے ہم کہ وہ کیا تھا اور یہ کیا سمجھا

ہمیشہ کیوں تری آنکھوں سے اشک جاری ہیں
ظفرؔ ہمیں بھی ذرا تو یہ ماجرا سمجھا

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفرؔ آج دل کی آگ
آ گے تو شعلہ سا کئی بار اُٹھ کے رہ گیا

جائے گا دم میں دیارِ یار تک پیکِ خیال | ورنہ جو جائے گا وہ منزل بمنزل جائے گا
میں چمن میں بھی رہوں گا دل گرفتہ اے صبا | دل نہیں ہے میرا وہ غنچہ کہ جو کھل جائے گا

غلط ہے گریہ کیجئے چھپکے رہنا کچھ نہیں اچھا
نہ کہنے میں مزا ہے منہ سے کہنا کچھ نہیں اچھا
ستم اس یار کا سہنے پہ سہنا اے دل اچھا ہے
ولیکن بات کا غیروں کی سہنا کچھ نہیں اچھا

پھر گیا مُنہ ترا عقبیٰ سے کہ جب دُنیا نے
اک طمانچہ ہوس عیش و طرب کا مارا

رفیقِ راہِ محبت کدھر گئے یارب! | کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا
سنا ہے جب سے کہ آتا ہے کوئی رشکِ بہار | بہ رنگ غنچہ ہے دل اے ظفرؔ کھلا پڑتا

کنارہ کش جو تو اے پُرغرور ہم سے ہُوا ۔ جتائی ہم نے محبّت قصور ہم سے ہُوا
ہزاروں دل میں تھے مطلب ہمارے پر منہ سے ۔ بیاں نہ ایک بھی ان کے حضور ہم سے ہُوا
ہم اس سے آپ رہے دور اپنی غفلت سے
وہ اے ظفر نہ کسی وقت دور ہم سے ہُوا

جُز بادہ ہمیں بادہ پرستی میں نہ سوجھا
کچھ سود و ضرر عالم مستی میں نہ سوجھا
جا بیٹھا ہے صحرا میں عبث شہر سے زاہد
کیا سوجھے گا جنگل میں جو بستی میں نہ سوجھا
پستی میں جو دیکھا وہ بلندی میں نہ دیکھا
سوجھا جو بلندی میں وہ پستی میں نہ سوجھا
نرگس کی روش آنکھ ظفر ہم نے جو کھولی
اس گُل کے سوا عالم ہستی میں نہ سوجھا

جہاں پہلے تھے ہم اب وُہ مکاں پایا نہیں جاتا
اگر ڈھونڈیں نشاں اس کا نشاں پایا نہیں جاتا
جہاں ہے خوب وہ ہی، ہے جہاں ہم کو سدا رہنا
مگر یاں وہ جہانِ جاوداں پایا نہیں جاتا
پھرے بھٹکا نہ کیوں کر طائرِ دل بہرِ آسائش
کہ اس باغِ جہاں میں آشیاں پایا نہیں جاتا

کہو گے حال دل کیا اے ظفرؔ ان مہ جبینوں سے
کہ ان کا تو دماغ اے مہرباں پایا نہیں جاتا

نہیں پرواز کی صیاد بال و پر میں جب طاقت
قفس سے ہم اسیروں کی رہائی گر ہوئی تو کیا
پہنچ سکتی نہیں فریاد اس مہوش کے کانوں تک
فلک تک آہ کو میرے رسائی گر ہوئی تو کیا

نہ کوئی یار پایا اور نہ کوئی آشنا پایا
جسے یاں دوست جانا اسکو دشمن جان کا پایا
پھرے ہم ڈھونڈتے مدت تلک راہ محبت میں
رفیق اپنا نہ کوئی بھی ترے غم کے سوا پایا

وہ سیکھے بے طرح کچھ بیر کرنا
مجھے ڈر ہے الٰہی خیر کرنا!
ہرا ہونے تو دو اس زخم دل کو
پھر آکر اس چمن کی سیر کرنا

دیکھے عذاب سوز محبت میں اس قدر
دل سے ہمارے خوف جہنم نکل گیا
پھر خواب میں بھی وہ نظر آیا نہ اے ظفرؔ
آنکھوں کے سامنے سے جو عالم نکل گیا

جو ہونا ہے آخر وہ ہو کر رہے گا — کرے کون بخت آزمائی کا دھندا
ظفر اس سے بہتر ہے آشنائی — کہ مشکل ہے یہ آشنائی کا دھندا

یوں گُم ہو جذب عشق کی تاثیر یا نصیب
اتنی ہو ان کے آنے میں تاخیر یا نصیب
تقدیر کے بگاڑ کی تدبیر کیا کریں
بنتی نہیں ہے کوئی بھی تدبیر یا نصیب
دل کو ہوئی نصیب نہ میرے شگفتگی
گا ہے بہ رنگِ غنچۂ تصویر یا نصیب

مُنعم و مفلس ہیں دونوں بزم ہستی میں خراب
مال مستی میں ہے وہ یہ فاقہ مستی میں خراب
یاں ترقی و تنزل ہے مثالِ گردباد
گہ بلندی میں ہیں ہم اور گاہ پستی میں خراب
حق پرستی کا جنہیں دعویٰ تھا اپنے اے ظفر
عشق کے ہاتھوں میں ہیں وہ بُت پرستی میں خراب

آشنا کون رہا کس سے رکھیں ہم صحبت — نہ وہ ہمدم نہ وہ ہمدرد نہ وہ ہم صحبت
کرتے کس لطف سے آپس میں ہیں یہ سرگوشی — شیشۂ و جام ہیں ساقی لیے جم جم صحبت

حرفِ رنجش درمیاں آنے کا کچھ تو ہے سبب
اے ظفر اس نے نہیں یہ بے سبب کی بات چیت

حجابِ آستاں بوسی ظفر یوں تو نہیں ہم کو
تصور سے مگر ہم چومتے ہیں یار کی چوکھٹ

جھکا رہی ہے جو یوں چشمِ سرمگیں نرگس
ابھی ہے کچھ چمنِ دہر میں حیا کا رواج

ہم نہ ہیں مال کے محتاج نہ زر کے محتاج
ہیں فقط تیری عنایت کی نظر کے محتاج
یا کبھی رہتے تھے گلشن میں ہی یا مدت سے
ہم قفس میں ہیں صبا گُل کی خبر کے محتاج
اشکِ لختِ جگر اپنے ہیں جو یہ دامن میں
ان کے دولت نہیں ہم لعل و گہر کے محتاج

قشقہ ماتھے پہ ہے زنّار گلے میں ہے ظفر
بن گیا عشق میں اس بُت کے برہمن سچ مُچ

مانیں نصیحتیں کہو کس کس کی ناصحو
دس کہتے ہیں کسی طرح اور سو کسی طرح

دیکھا جب گردش کو تری چشم کی اے فتنہ گر
ہم نے جانا گردشِ تقدیر کو اچھی طرح

بچشم غور جو دیکھا ظفر زمانے میں
تو یا زمین کا یا زن کا یا ہے زر کا فساد

چاہتے ہیں کب نشاں اپنا وہ مثلِ نقشِ پا
جو کہ مٹ جانے کو بیٹھے ہیں فنا کی راہ پر

دن اور ہے رات اور زمیں اور زماں اور
رہتے ہیں زخود رفتہ جہاں ہے وہ جہاں اور
یک بار کیے نذر دل و جاں تیری دونوں
اب کیا تجھے دیں ہم کہ نہ دل اور نہ جاں اور
کچھ چشم تر اور سوزِ جگر پر نہیں موقوف
افشائے محبت کے بہت سے ہیں نشاں اور
محفل سے اٹھا غیر کو اور اس کے عوض تو
رکھ دے مری چھاتی پہ کوئی سنگِ گراں اور
مینھ خوب برستا ہے جو ہوتی ہے ہوا بند
بہتے ہیں ظفر اشک دم ضبطِ فغاں اور

دل کی ہی دل میں رہی مُنہ سے نہ کچھ دل کی کہی
گم ہوئے سامنے اس کے دمِ تقریر حواس

نہ خبر لی مری اس بے خبری کو شاباش
مرگیا میں تری بے دادگری کو شاباش
کیا پرواز کی تکلیف سے آزاد مجھے
کہوں کس طرح نہ بے بال وپری کو شاباش
دل سے جاتا ہی نہیں تیرے ظفرؔ اس کا خیال
خوب شیشے میں اتارا ہے، پری کو شاباش

گر سخن میں عشق کی گرمی نہیں
اے ظفرؔ ہرزہ سرائی ہے فقط

ہم تو چلتے ہیں لو خدا حافظ
بُت کدے سے بُتو خدا حافظ

ظفرؔ آساں نہیں قابو میں زباں کا رہنا
آتی مشکل سے ہے یہ قبضۂ انساں میں تیغ

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفرؔ ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

قسمت ہی مخالف ہے فقط عشق میں اپنی — نے یار مخالف ہے نہ اغیار مخالف
کیوں وادیٔ وحشت میں نہ کھٹکا ہو مجھ کو — ہر جھاڑ ہے دشمن مرا ہر خار مخالف

ہو صلح کل اسے دل کے سب اٹھ جائے لڑائی
کافر نہ مخالف ہو نہ دیں دار مخالف

برگشتہ زمانہ ظفر ایسا ہوا ہم سے
جو یار موافق تھے وہ ہیں یار مخالف

ہوئی غیروں کو خطا کی جو بے تعزیر معاف — اس کا باعث بھی بتا دوں جو ہو تقصیر معاف
مدتوں تو نے دیئے ہم کو جہاں میں چکر — اب تو رکھ کوئی دن اے گردشِ تقدیر معاف

کیا کیا تھے آشنا نہ رہا ایک بھی ظفر
افسوس سب کے سب ہوئے بحرِ فنا میں غرق

وہم کی راہ نہیں اے دلِ آگاہ ہے ٹھیک — راہ جو صدق و صفا کی ہے وہی راہ ہے ٹھیک
دل گدا کا ہو جو دولت سے قناعت کی غنی — شاہ کیا بلکہ اسے کہنا شہنشاہ ہے ٹھیک

جو برابر جانتے ہیں رتبۂ شاہ و گدا
ان کے نزدیک اے ظفر توقیر ہے دونوں کی ایک

ہے یاں کی شیخ کشف و کرامت یہیں تلک
شیخی یہیں تلک ہے شیخت یہیں تلک
لے کر گیا نہ یاں سے کوئی ساتھ ملک و مال
رہتی ہے یاں کی دولت و حشمت یہیں تلک
توجا کے یاں سے پھر نہیں رہنے کا حکمراں
ہے تیری چند روز حکومت یہیں تلک

چھوٹ گئے خانۂ زنداں سے ہزاروں قیدی
پر چھٹا تیری محبت کا نہ زندانی ایک

ظفر بہار گلوں پر چمن میں ہے دو روز
رہے ہے رونق رخسار یار برسوں تک

واقعی جینا انھیں کا ہے بھلا دنیا میں
اے ظفر کرتے ہیں جو کام بھلائی کے لوگ

غم و الم سے نجات پاؤں کہ میں نہایت عذاب میں ہوں
بڑا ہی احساں کرے اگر تو کرے نہ اب اے قضا تامل
ظفر وہ رنگ و شتاب میں ہیں نکلتے انساں کے کام لیکن
کرے وہ جلدی کی جائے جلدی کرے تامل کی جا تامل

نے خرد نے ہوش نے تدبیر پر شاکر ہیں ہم
دوستو اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم

کرتے کیا کیا شکر کچھ ہوتا جو نالوں میں اثر
جبکہ اپنی آہِ بے تاثیر پر شاکر ہیں ہم

ہاتھ سے قاتل کے کچھ شکوہ نہیں کرتے کبھی
رکھ کے آپ اپنا گلا شمشیر پر شاکر ہیں ہم

ہے ظفرؔ ہم سے جفاکش کون زیرِ آسماں
ہر جفائے آسمانِ پیر پر شاکر ہیں ہم

جوں بوئے گُل رفیق نسیمِ چمن ہیں ہم
اے دوستو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

یارو نہ روکو عشق میں رونے سے تم ہمیں
اس سے بجھاتے دل کی کچھ اپنے لگن ہیں ہم

ہیں گرچہ مثلِ شمع سراپا زباں تو کیا
کہہ سکتے پر زباں سے نہیں اک سخن ہیں ہم

بلا سے گرچہ ہوتا رازِ دل افشا ہے رونے میں
نہ روکو مجھ کو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں

ظفرؔ ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے
رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

صنما ہم کہیں تو کیا کہویں — بخدا ہم کہیں تو کیا کہویں
مدّعی کہنے ہی نہیں دیتے — مدّعا ہم کہیں تو کیا کہویں
نہیں فرصت جو کہتے حسرتِ دل — حسرتا ہم کہیں تو کیا کہویں
بن کہے ہی وہ اے ظفرؔ ہم سے
ہے خفا ہم کہیں تو کیا کہویں

بستے تھے وہ جو لوگ یہاں کوئی بھی نہیں
خالی پڑے ہیں ان کے مکاں کوئی بھی نہیں
دل سوز غیر سوز یہاں کوئی بھی نہیں
ہمدم سوائے آہ و فغاں کوئی بھی نہیں
میں دل کو جانتا تھا بڑا دوست عشق میں
دیکھا تو ایسا دشمنِ جاں کوئی بھی نہیں
شکووں سے یوں تو دل ہے لبالب مگر کبھی
آتا ہمارے تا بہ زباں کوئی بھی نہیں
لوں کس کو اپنے ساتھ رفاقت میں اے ظفرؔ
صبر و شکیب تاب و تواں کوئی بھی نہیں

کہیے اپنا کسے اپنا تو کوئی ہے ہی نہیں — جو ہے بیگانہ ہمارا تو کوئی ہے ہی نہیں
وائے قسمت جسے ہم جانتے تھے دوست یہاں — جلیسا دشمن ہے وہ ایسا تو کوئی ہے ہی نہیں

کیا کروں غم کو نہ سمجھوں اگر اپنا غمخوار دل کے دینے کو دلاسا تو کوئی ہے ہی نہیں
قدرت حق کا تماشا ہے ظفرؔ جیسے بشر
ایسا دنیا میں تماشا تو کوئی ہے ہی نہیں

بتوں نے نہ کیں آشنائی کی باتیں کہیں اور ساری خدائی کی باتیں
نہیں تم کو لازم برائی کی باتیں بھلوں کو ہے زیبا بھلائی کی باتیں
غضب ہے کہ دل میں تو رکھو کدورت کرو منہ پہ ہم سے صفائی کی باتیں
شب وصل بھی مجھ کو روتے ہی گذری جو یاد آئیں روز جدائی کی باتیں
ظفرؔ دل میں بستی ہے رندی و مستی
نہ منہ سے بنا پارسائی کی باتیں

دل دے کے ہوا اس کو گناہ گار تو میں ہوں
دے کس کو سزا وہ کہ سزاوار تو میں ہوں
ہو کون کہ ایذا ہو جسے اپنی گوارا
ہوں اپنے اگر در پہ آزار تو میں ہوں
کہتا ہے مجھے عشق کہ تو غم سے ہراساں
کس واسطے ہے تیرا مددگار تو میں ہوں
بوسہ ترے لب کا مرض غم کی دوا ہے
کیوں اور کو دیتا ہے کہ بیمار تو میں ہوں

لوں جاں تلک بیچ کے مول اسے ظفر اس کو
یوں جنسِ محبّت کا طلب گار تو میں ہوں

آج تک معلوم یہ مجھ کو نہیں کیا چیز ہوں
کون ہوں کیا شے ہوں میں ناچیز ہوں یا چیز ہوں
ہو گیا دل میرا دولت سے قناعت کی غنی
جانتا دنیا کو میں کیا مال ہوں کیا چیز ہوں

کیا کہی بات ہم نے تم سے خلاف — روٹھ جانے کی باتیں اور ہی ہیں
ہم کہاں اور کہاں قفس صیّاد — آب و دانے کی باتیں اور ہی ہیں
ظفر اگلا زمانہ تھا کچھ اور
اس زمانے کی باتیں اور ہی ہیں

گئی آہ جگر کہیں کی کہیں — جا ہی پہنچی خبر کہیں کی کہیں
میں کہوں بات تو وہ لے جائیں — جی میں کچھ سوچ کر کہیں کی کہیں
ہو گا پردے سے کیا کہ پردہ نشیں — میری پہنچی نظر کہیں کی کہیں
میری وحشت لیے پھرے ہے مجھے
ان دنوں اے ظفر کہیں کی کہیں

واہ اس صورت کدے میں دیکھتے ہی دیکھتے
صورتیں کیا کیا نظر سے اپنی پنہاں ہو گئیں

نے ہے بت خانے میں نے کعبے میں ہے جو دل میں ہے
اور اگر دل ہی کے اندر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
غم ہے کیا ساقی کہ ہستی کا نہیں کچھ اعتبار
تو دیئے جا بھر کے ساغر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
خوبیٔ تقدیر کے ہیں ساتھ ساری خوبیاں
اور اگر اے دل مقدر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
غم نہیں ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہیں ہم
ہے تو ہے سب کچھ میسّر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
خوبیٔ جوہر سے ہے انساں کی قدر و منزلت
اور اس میں خوب جوہر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
تم جو کہتے ہو ظفر کو کچھ نہیں یہ آدمی
خیر بہت بندہ پرور کچھ نہیں تو کچھ نہیں

نے کبھی ہوں شاد شادی میں نہ غمگیں غم ہوں میں
میرا عالم اور ہے میں اور ہی عالم میں ہوں
جو مقدر میں ہے اس سے نے زیادہ ہو نہ کم
میری نادانی ہے گر میں فکر بیش و کم میں ہوں

بس ہیں دل کہہ تو کسی دم سے نہ پوچھو نہ گچھو
ہمیں کیا پوچھتے ہو ہم سے نہ پوچھو نہ گچھو
پوچھ لو دل سے ظفرؔ پوچھتے ہو جو تدبیر
اور کچھ مردمِ عالم سے نہ پوچھو نہ گچھو

گالیاں دے چکے اب نالہ وزاری تو سنو | اپنی سب کہہ چکے تھوڑی سی ہماری تو سنو
نہ سنو تم مری توقیر کی باتیں نہ سنو | پر بلا سے مری تم ذلّت و خواری تو سنو
ناصحو حالِ غمِ عشق سنو تم کیوں کر | ہو وے حالت جو ہماری سی تمہاری تو سنو
اے ظفرؔ سنتے ہو کیوں باتیں کسی کی بیکار
کچھ اگر سننے سے ہو کار براری تو سنو

ہنسی سے ہم نے ذرا چھولئے جو یار کے پاؤں | تو اس نے کھینچ عجب ایک چیخ مار کے پاؤں
یہ تنگنا ہے جہاں اے ظفرؔ نہیں وہ جائے | کہ سو وے چین سے کوئی یہاں پسار کے پاؤں

اس چمن میں کیا کرو گے مے کشو ہنس بول کر
غنچہ ساں خاموش خونِ دل کو پی کے ہو رہو
کرتے ہو برباد اپنی خاکساری کیوں ظفرؔ
اس کی خاکِ درِ غبار اس کی گلی کے ہو رہو

آؤ گھر میں مرے صنم آؤ — تمہیں اللہ کی قسم آؤ
قاصدو لاؤ جلد خط کا جواب — ایک دم جاؤ ایک دم آؤ
دیکھوں میں کب تلک تمہاری راہ — آ گیا آنکھوں میں میرا دم آؤ

جاؤ تنہا نہ تم، تمہارے ساتھ — جائے گی میری جاں، کھڑے تو رہو
قد پہ نازاں ہے اپنے سروِ چمن — اک ذرا تم بھی ہاں، کھڑے تو رہو

کیا کہوں بے دولتی و بدنصیبی اپنی میں — جب ہما پر ہاتھ ڈالا ہی تو زاغ آیا ہے ہاتھ
عشق کی دولت سے ہو کیونکر نہ دل اپنا غنی — ملکِ وحشت ہاتھ آیا نقدِ دل آیا ہے ہاتھ
ہاتھ دنیا سے اُٹھایا ہے جنھوں نے اے ظفر — رہتے ہیں وہ با فراغ انکو فراغ آیا ہے ہاتھ

ہر جگہ ایک نیا رنگ ہے اللہ اللہ
واہ کیا جلوہ نیرنگ ہے اللہ اللہ
تیرا اس میکدے میں اے بتِ سرمست و غرور
کچھ عجب رنگ عجب ڈھنگ ہے اللہ اللہ
لبِ گُل برگ سے لے تا بہ زبانِ سرِ خار
سب پہ گلشن میں اک آہنگ ہے اللہ اللہ
برگِ گُل بھی تھا گراں جن کے تنِ نازک پر
ان کی چھاتی پہ دھرا سنگ ہے اللہ اللہ

چھوڑ کر اس بُت کافر کے ظفرؔ در کا طواف
آپ کو کعبے کا آہنگ ہے اللہ اللہ

ہم دیکھ چکے خوب تماشائے زمانہ — اچھا ہے جو کچھ اور نہ دکھلائے زمانہ
کیا ہووے کوئی ساغرِ عشرت کا طلبگار — خالی ہے مئے عیش سے مینائے زمانہ
ڈھونڈو تو زمانے میں نہیں مہر و محبت — کس طرح کا آیا ہے ظفرؔ ہائے زمانہ

کہوں کیا جوشش اشکوں کا معاذ اللہ معاذ اللہ
اُمنڈ آیا ہے اک دریا معاذ اللہ معاذ اللہ
جگر تو دیکھ تو میرا نہ کی اک آہ بھی میں نے
کئے تو نے ستم کیا کیا معاذ اللہ معاذ اللہ
کیا غارت ہزاروں کو ظفرؔ دنیا کی دولت نے
بڑی آفت ہے یہ دُنیا معاذ اللہ معاذ اللہ

دل کو وُہ رنج دے آمین اللہ — اور یہ سب سہے آمین اللہ
جو ستائیں تجھے ان کو بھی ظفرؔ — عوض اُس کا ملے آمین اللہ

کہوں کس سے بے مہریاں اس فلک کی — کہ سب اُٹھ گئے مہرباں اچھے اچھے
لڑیں کیا زمانے سے کُشتی کہ اس نے — پچھاڑے بہت پہلواں اچھے اچھے

ظفؔر ہے وہ گرمی تمہارے سخن میں
کہ جلتے ہیں آتش زباں اچھے اچھے

بچے نگاہ سے دل تیرے کس طرح ظالم
کہ ہے جہاں میں کہاں ناوکِ قضا کی پناہ

جو مصیبت ہمیں قسمت نے دکھائی دیکھی
پہ دکھائے نہ ظفؔر اس کی جدائی اللہ

طاقت نہیں پھرنے کی عادت لئے پھرتی ہے
یا صرف مجھے میری ہمت لئے پھرتی ہے
خورشید صفت مجھ کو ہے شوقِ جہاں گردی
طالع لئے پھرتے ہیں قسمت لئے پھرتی ہے
کیا جانے ظفؔر کس کو یہ بھولیں ہیں آہو کے
صحرا میں ان آنکھوں کی وحشت لئے پھرتی ہے

جو دل پہ ہے گزرتی کچھ دل ہی جانتا ہے
بتلاؤں اے ظفؔر کیا اس دل کا حال کیا ہے

آئے وہ جب کہ کہہ نہ سکے کچھ بھی ان سے ہم
حسرت سے اک نگاہ فقط کر کے رہ گئے

نہیں ہے کس میں اسے دیکھ لو سبھی میں ہے
کہ لیکے عرش سے تا فرش وہ سبھی میں ہے
سکھائی ماہ وشوں کو جو اس نے بے مہری
تو اب سبھی میں یہ عادت، یہ خو سبھی میں ہے
ظفرؔ یہ بھید ہے کیا جانے کیا نہیں کھلتا
کہ ڈھونڈتے ہیں سبھی اس کو جو سبھی میں ہے

نہ ہو نصیب میں صحت تو کیوں کہ ہو صحت
مگر طبیب نے میری دوا بری تو نہ کی
بتوں نے کی جو بھلی ہم سے وہ بھلی ہی سہی
پر ان سے ہم نے بھی شکر خدا بری تو نہ کی
ظفرؔ بھلائی ہیں دی اس کی تو نے جاں اپنی
صد آفریں تجھے صد مرحبا بری تو نہ کی

جو تیری یاد جلوۂ قامت میں سو گئے
گویا وہ عرصہ گاہ قیامت میں سو گئے
ان غافلوں نے دیکھا تماشہ جہاں کا کیا
جو مست ہو کے نشۂ دولت میں سو گئے
ہم سوتے زیر خاک نہ آرام سے مگر
جاگے بہت تھکے رنج و مصیبت میں سو گئے
جتنے جگائے فتنۂ خوابیدہ حرص نے
سب آ کے میرے کنج قناعت میں سو گئے

سوئے ہزار فتنے قیامت کے اے ظفرؔ
وہ اہلِ دل جو نشۂ دولت میں سو گئے

ہمیں میں رنج بھی ہے اور راحت بھی ہمیں میں ہے
جہنّم بھی ہمیں میں اور جنّت بھی ہمیں میں ہے
کہیں مشہور ہم عاقل کہیں بد مست لایعقل
کہ ہشیاری بھی ہم میں اور غفلت بھی ہمیں میں ہے
نہیں غیر از صلاح و خیر واں تو اور کچھ ہرگز
ظفرؔ شر بھی ہمیں میں ہے شرارت بھی ہمیں میں ہے

صورت اس بُت کی کبھی جا ہم نشیں دیکھی تو تھی
دیر میں کعبہ میں یا دل میں کہیں دیکھی تو تھی
حال مضطر کا ترے کیا جانے کیا تھا زیرِ خاک
پر لرزتی اس کے مدفن کی زمیں دیکھی تو تھی

کہیں ایسا نہ ہو کھُل جائے دل کا راز محفل میں
ہماری آنکھ پھر اس رونقِ محفل سے ملتی ہے

بال زُلفوں کے جو وُہ مُنہ پر بکھیرے آئیں گے
روز روشن میں بھی گویا منہ اندھیرے آئیں گے

شکستِ شیشۂ دل کیا کہوں کہ اک آواز
ترسے بھی کان میں اے دل شکن گئی ہو گی

ظفر کھو آئے دل سی چیز اپنی بے خودی میں ہم
خدا جانے کہ کس کو دی، کِدھر پھینکی کہاں چھوڑی

نہ ہو گی اے عزیزو ایسی مے خواری میں بے ہوشی
ہمیں جیسی رہی ہے عین ہشیاری میں بے ہوشی
دل بیدار ہی کیا دیدۂ بیدار سے حاصل
مرے نزدیک ہے غافل وہ بیداری میں بے ہوشی

ظفر اس عالمِ پیری میں تیرے وہ ارادے ہیں
کہ جن میں تھک کے رہ جاتی جوانوں کی جوانی ہے

ظفر آنکھیں کہے دیتی ہیں تیری کیا چھپاتا ہے
مئے الفت کی کیفیت چھپائے سے نہیں چھپتی

خوش رہتے ہیں مشغول جو ہیں حرص و ہوا میں
اپنے تو حواس اُڑتے ہیں دُنیا کی ہوا سے

کھاتی ہمیشہ غم ہے لہو پیتی جاں ہے
کس طرح سے نہ کھائے پیے جیتی جاں ہے

جب کوئی بات دردِ محبت کی چل پڑی
آنسو کی بوند آنکھ سے اپنی نکل پڑی
میں ہوں وہ خود گرفتہ مری شکل دیکھ کر
تلوار تیرے ہاتھ سے قاتل اُگل پڑی
فرہاد و قیس کا تو ظفرؔ شہرہ ہو چکا
اب اپنی دھوم جانبِ دشت و جبل پڑی

بات وہ کرتا نہیں لیکن اِدھر چپکے چپکے دیکھتا جاتا تو ہے
خواب میں آکر کبھی وہ اے ظفرؔ فتنۂ خفتہ جگا جاتا تو ہے

ظفرؔ ایسی نہیں ہے کوئی محفل اس زمانے میں
جہاں کچھ حرف گیری اور سخن چینی نہیں ہوتی

خدا بچائے ظفرؔ دوستی سے اس دل کی
جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

نہ تو بُت خانے سے ہے کام کچھ اے حضرتِ دل
اور نہ مطلب ہے حرم سے تمہیں کیا بھاتا ہے
غافلو سینکڑوں ہستی میں تماشے ہیں کہو
تم جو یاں آئے عدم سے تمہیں کیا بھاتا ہے

کی ہے جس نے یار کے در کی گدائی اختیار
بادشاہی ہے تمام اس پر امیری ختم ہے
کہتے ہیں اہلِ سخن تیرا سخن سُن کر ظفرؔ
بس یہاں طرزِ ظہوری و نظیری ختم ہے

شعلۂ فانوس کے مانند سوزِ عشق سے
داغ نے پیدا میرے زیرِ کفن کی روشنی
نام روشن حشر تک ان کا رہے گا اے ظفرؔ
دی خدا نے جن کو عالم میں سخن کی روشنی

شفق شام و سحر پھولی فلک پر جس کی سُرخی سے
مرے نالوں سے ایسی آگ ساری رات میں پھیلی

کون وہ غمخوار ہے میرا جو غم خواری کرے
حضرتِ غم تم کو میری غم گساری چاہیئے
خاک کا پُتلا ہے انساں اے ظفرؔ اس کیلئے
سرکشی اچھی نہیں ہے خاکساری چاہیئے

مجھے کہتے ہیں دیکھ کر بعضے بعضے — کہ ہوتے ہیں ایسے بشر بعضے بعضے
ظفرؔ دوستدار اب جہاں میں کہاں ہے — غنیمت سمجھ ہیں اگر بعضے بعضے

قدِ رعنا کی سی تیری اس میں رعنائی کہاں
سرکشی میں یوں تو ہاں سروِ چمن بھی ایک ہے
روز اُٹھاتا ہے زمیں پر تازہ فتنے سیکڑوں
فتنہ سازی میں ظفرؔ چرخِ کہن بھی ایک ہے

جانتے ہیں اہلِ دنیا جیسی پڑھتے ہیں نماز
پر بلا سے سرکشوں کا سر ذرا جھکتا تو ہے

نہیں معلوم دل کا باعثِ رنج و قلق کیا ہے — اور اس رنج و قلق میں دیکھیے منظورِ حق کیا ہے
دیا پیغام جو قاصد نے تجھ کو ہم سے تو کہہ دے — ظفرؔ کیوں ہو گیا سُنتے ہی تیرا رنگ فق کیا ہے

کوچۂ حرص میں لے جائے نہ انساں کو خدا
کہ وہاں تو سگِ دنیا ہیں بھنبھوڑے کھاتے
ٹانکے پیراہنِ تن کے مرے فرقت میں تری
روِشِ مور چگاں ہیں مجھے توڑے کھاتے

بن آئی وہاں کچھ نہیں ایسی ویسی
جو چاہو سو کر لو نہیں ایسی ویسی
غنیمت ہے مِل جائے مدفن کو میرے
اگر اس گلی میں زمیں ایسی ویسی
بتا کیا کریں ہم اگر دل پہ گزرے
محبت میں اے ہم نشیں ایسی ویسی
خدا کے لئے اے ظفرؔ ان کے آگے
نہ کہہ بیٹھیو تو کہیں ایسی ویسی

اے ظفرؔ جو شباب کے دن تھے
بس وہی خورد و خواب کے دن تھے
دورِ عشرت تھا اور عہدِ نشاط
جامِ صہبائے ناب کے دن تھے
تھا نہ کچھ دل میں خوفِ روزِ حساب
گنۂ بے حساب کے دن تھے
نہ یہ راتیں تھیں آہ و زاری کی
اور نہ یہ رنج و تاب کے دن تھے
رہے پیری میں اس لئے جیتے
دیکھنے کچھ عذاب کے دن تھے

وہ بیٹھے ہیں خفا کیا جانے کیا ہے　　کسی نے کہہ دیا کیا جانے کیا ہے
محبت کی حلاوت ہم سے پوچھو　　کوئی اس کا مزا کیا جانے کیا ہے
نگہ تیری کوئی برقِ بلا ہے　　کہ ہے تیغِ قضا کیا جانے کیا ہے
ظفرؔ ہے خاک کا پتلا یہ انساں
پر اس میں بولتا کیا جانے کیا ہے

وہ جھوٹ سے جو زمیں آسماں ملا دیں گے
تو پاس جتنے ہیں سب ہاں میں ہاں ملا دیں گے
نہ پائے گا کوئی ہم کو بہ رنگِ نقشِ قدم
ہم ایسا خاک میں اپنا نشاں ملا دیں گے
بتوں سے ملتے ہو جھک جھک کے کیوں ظفرؔ اتنا
یہ کیا خدا سے تمہیں مہرباں ملا دیں گے

کیا اور اس سے ہوگا زمانے کو انقلاب
جو بات عیب کی تھی ہنر ہو گئی تو ہے

ہڑبان بھاکھا

بیم اگن نت موہے جراوے یا کا بھید کہوں کا سے
پی ہو پاس تو جی ہو ٹھنڈا اپنی بپتا کہوں دا سے

رتیاں گجارُوں روت روت دن کو گجارُوں آہاں کھینچ

میرے من کی موسوں نہ پوچھو، پوچھو میری بپتا سے

یا ہی برہا درجن ہووے یا ہی برہا سرجن ہووے

ناچھوٹے یا بڑہا موسوں ناچھوٹوں میں برہا سے

نہیں کھلے کچھ اور ہی دیکھوں موندوں توکچھ اور ہی اور

کو دوا کو سانچ نہ جانے دیکھی بات کہوں جا سے

من کے اندر پیا قلندر تیرے ظفر وہ آن بسا

کام پڑو جب واسوں تہارو کام رہا کیا دنیا سے

انتخابِ دیوانِ چہارم

جسے خیال ہے کچھ رحمتِ الٰہی کا
گناہ سمجھے ہے دعویٰ وہ بے گناہی کا
یہ لطف دیکھ کہ خود بے نیاز ہے لیکن
دھیان ہے اسے بندوں کی خیرخواہی کا

کیوں نہ ہو عالم پہ احساں احمدِ مختار کا
ہے وُہ مالک خالقِ کونین کی سرکار کا
کہتے ہیں موسیٰ کو غش آیا تھا کوہِ طور پہ
اک تصرف تھا وہ تیرے جلوۂ دیدار کا
کہتے ہیں عیسیٰ کو تھا مُردے جلانے میں کمال
اک کرشمہ تھا وہ تیری خوبیٔ گفتار کا

تابشِ خورشید محشر کا مجھے کیا غم ظفرؔ
بیٹھنے والا ہوں کس کے سایۂ دیوار کا

اچھا کیا گر ہم کو بُرا جان کے چھوڑا ،
پر حیف کہ غیروں کا کہا مان کے چھوڑا
غم آیا جو دل میں تو گئی جاں نکل اپنی
گھر اس نے ظفرؔ خوف سے مہمان کے چھوڑا

وہ ابھی ہم پر جفا کرتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا کرتا ہے کیا
تجھ پہ کرتا ہے جو کوئی جاں فدا
تو ہی مُنصف ہو برا کرتا ہے کیا
دل ہزاروں روز لے جاتا ہے تو
یہ بتا اے دل رُبا کرتا ہے کیا

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر
تم نے یاں غُل مچا کے کیا پایا
نہ بُجھا سوزِ دل جب آنکھوں سے
ہم نے دریا بہا کے کیا پایا
کُشتۂ تیغِ غم سے پوچھ اپنے
تو نے جی سے گُزر کے کیا پایا
حاسدوں نے ظفرؔ مرے سر پر
پوچھ بہتان دھر کے کیا پایا

طوفاں بپا یہ گریے کی شدّت نے کیا کیا
مجھ کو ڈبو دیا غمِ الفت نے کیا کیا

مجھ سے جو کچھ کیا سو محبت نے آپ کی
اے مہرباں کسی کی عداوت نے کیا کیا
اس بے وفا پہ مجھ کو کیا مبتلا ظفرؔ
مجھ سے سلوک یہ مری قسمت نے کیا کیا

کہاں تک چپ رہوں چپکے رہے سے کچھ نہیں ہوتا
کہوں تو کیا کہوں ان سے کہے سے کچھ نہیں ہوتا
شگفتہ ہو گل و بلبل سے تجھ بن کیا چمن میں دل!
ہنسی سے اس کی اس کے قہقہے سے کچھ نہیں ہوتا
نہیں ممکن کہ آئے رحم اس کو اے ظفرؔ مجھ پر
سہوں اس کے ستم کیا میں، سہے سے کچھ نہیں ہوتا

مری روش پہ ہو آتش نوا اگر بلبل
تو ایک نالہ سے دے صد ہزار باغ جلا

سب یار کوچ کر گئے میری کھلی نہ آنکھ
غفلت نے کیا کہوں مجھے کیسا سلا دیا
تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

دے روز ساقیا مجھے دو چار جام مے
دو چار روز اور ہے موسم بہار کا
یاس و غم و الم تپش و داغ رنج و درد
بھاتا ہے ساتھ مجھ کو انھیں تین چار کا

ہائے کہیے کسے یہاں اپنا　　کون اپنا ہے اور کہاں اپنا
ہو نہ جانِ جہاں نہ ہرگز دوست　　اور دشمن ہو اک جہاں اپنا
ہم ہوئے پیر اے ظفرؔ لیکن　　دل ہے اب تک وہی جواں اپنا

کھٹکتا خارِ غم کا چین اک دم بھر نہیں دیتا
نکالوں چیر کر دل پر کوئی نشتر نہیں دیتا
پڑا میں کروٹیں لیتا ہوں ساری رات بستر پر
ذرا آرام سے سونے دلِ مضطر نہیں دیتا

کیا ہے عشق نے یہ جبر ورنہ دل پہ مرے
نہیں تمہارا کبھی اختیار پہلے ہوا
ظفرؔ رہا وہ بشر خوب اوّل و آخر
جو خاک ہیچ ہوا خاکسار پہلے ہوا

لگا ہُوا ہے ہمارے دم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دُکھڑا
چھُٹے گا تا زندگی نہ ہم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دُکھڑا

یہ جانو اپنی ظفر کہانی کہی ہے اوروں کی داستان ہیں
ہوا اگر اس اسیر غم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دُکھڑا

زندگی دے چکی تھی ہم کو جواب | پر پیام حبیب آپہنچا
بارے کر پڑ کے قافلے والو | اب تو یہ بھی غریب آپہنچا

جبکہ ہستی میں عدم سے یہ بشر آہی گیا
جو پسِ پردہ تھا وہ پیش نظر آہی گیا

ہوئی تقسیم ازل سے جو مری آتش رواں | کوئی دوزخ کے بھی حصے میں شرر آہی گیا
دستبردار ہوں کیا دل پہ سنگیں دل سے | ہاتھ پتھر کے تلے اب تو ظفر آہی گیا

خاک اڑانی تھی اُڑائی ہم نے مثل گردباد
نے بلندی میں اٹھایا کچھ نہ پستی میں مزا
چھوڑ کر کعبہ کو جو آتے ہیں بُت خانے میں ہم
اے ظفر آتا ہے کچھ تو بُت پرستی میں مزا

جو کچھ لکھا تھا پیشانی میں سب وہ اپنی پیش آیا
بھلا تھا سو بھلا دیکھا بُرا تھا سو بُرا دیکھا
ظفؔر کی سیر اِس گلشن کی ہم نے پر کسی گُل میں
نہ کچھ اُلفت کی بُو پائی، نہ کچھ رنگِ وفا دیکھا

مستِ مئے پندار ہیں یہ مردمِ دُنیا
بھولے سے بھی اے دل انھیں ہشیار نہ کہنا
ہم نے بھی کیا عہد کہ دردِ دلِ بیتاب
مر جانا مگر تجھ سے ستم گار نہ کہنا
چھپکے سے مرا خط انھیں دے دیجیو قاصد
کچھ مُنہ سے خبردار خبردار نہ کہنا

عزیزو کام نہ کس کس کا یاں بنا بگڑا
ہمارے پیشِ نظر اک جہاں بنا بگڑا
رہی نہالِ چمن ہی سے اُلفت اے صیّاد
ہزار بار مرا آشیاں بنا بگڑا
فلک کے ہاتھ سے بازارِ دہر میں آکر
نہ کون باعثِ سود و زیاں بنا بگڑا

ہے ایک ایک سے لینا جہاں کا بدلا
جنھوں نے رنگ مری عزت و شان کا بدلا
خدا ہی جانے عداوت ہے مجھ سے کیا ایسی
مجھی پہ رنگ سدا آسمان کا بدلا

ہو وے کس کس لطف سے خدمت گذاری آپ کی
شیخ جی تشریف فرما ہوں اگر رندوں میں آپ

نے ہم ہیں شاہ دوست نہ ہم ہیں وزیر دوست
پر اُن کے دوست دار ہیں جو ہیں فقیر دوست
دشمن ہی کیا ہیں چشم حقارت سے دیکھتے
رکھتا ظفرؔ نظر میں ہے ہم کو حقیر دوست

طاقت و ہوش ہوئے ہم سے جدا اچھّے وقت
دی بڑھاپے میں ہمیں سب نے دغا اچھّے وقت

دم ناک میں ہمارا یہ لاتے ہیں بے ہُنر
یارب کرم سے تو کسی صاحب ہُنر کو بھیج
مانند نقشِ پا یہ وہیں کا نہ ہو رہے!
اے عشق اس گلی میں نہ تو اب ظفرؔ کو بھیج

غم خانۂ دُنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ
اس بے مزگی پر کوئی جیتا ہی تو کیا ہیچ
کیا کیا محل و قصر بناتے ہیں تو انگر
از بہرِ نشاں ایک نشاں بعد فنا ہیچ

ہر شے میں ہے تو، جلوہ نما واحد و شاہد
اللہ ترا جلوہ ہے کیا واحد و شاہد
سب رنگ ترے اور ترا رنگ نرالا!
تو سب میں ہے اور سب سے جدا واحد و شاہد
پردے کو دوئی کے جو درِ دل سے اُٹھایا
بے پردہ تجھے دیکھ لیا واحد و شاہد

شوخی اِس چشم سیہ کی ہے نگہ میں اس قدر
کوندتی بجلی نہیں ابرِ سیہ میں اس قدر

صبح کچھ اور شام ہے کچھ اور   رنگ بدلے ہے کیا زمانہ روز

اے ظفرؔ اس سنگدل سے دل بچانا چاہیئے،
دیکھ اے ناداں نہ رکھ شیشے کو تو پتھر کے پاس

کیا بڑھاپے میں کریں بادہ پرستی کی ہوس
گئے مستی کے دن ہو چکی مستی کی ہوس
خاک ہو چلیں انھیں جن کو بگولے کی طرح
گہ بلندی کی ہو خواہش گہے پستی کی ہوس

ہم وہ آوارہ و سرگشتہ ظفرؔ ہیں کہ ہمیں
نہ تو ویرانے کی پروا ہے نہ بستی کی ہوس

عقبیٰ کی ظفرؔ چاہیئے کچھ فکر بشر کو
بے ہودہ ہے دنیا کی مہمات میں تشویش

گناہِ مست ساقی سے عجب کیا   اگر صوفی ہو میخواری میں مخصوص

جو ہوا اے شوخ بیمارِ غمِ فرقت تیرا
نے شفا سے اس کو نے اس سے شفا کو ہے غرض

شمع سے گُل گیر کیا ہو تاجِ زر کی احتیاط
عشق میں اس سے نہ ہو جب اپنے سر کی احتیاط
سیکڑوں محتاط ہوکر دخترِ رز سے خراب
کھو گئے اس میکدے میں عمر بھر کی احتیاط
اے ظفرؔ سینے میں بھڑکا اپنے شعلہ عشق کا
ہو چکی دل کی حفاظت اور جگر کی احتیاط

تجھ بِن شرابِ عیش کے پینے پہ چار حرف   اور اس طرح کے بے مزہ جینے پہ چار حرف

لا ایک حرف شکوہ زباں پہ نہ چرخ کا
بھیج اس ستم شعار کمینے پہ چار حرف

اُلفت کی شرح سے ہیں بیاضیں بہت سیاہ
پھیلے ہیں یہ ہزار سفینے پہ چار حرف

روزِ ازل سے نام محمدؐ کے اے ظفر
کندہ ہیں اپنے دل کے نگینے پہ چار حرف

ہم وہ عادی ہیں غمِ عشق میں مر جائیں گے
لیک ہونے کی نہیں ہم سے یہ عادت موقوف

بُلبُل ہزار میری طرح سے ہو نالہ کش
میرے اور اس کے نالہ میں ہوگا اثر کا فرق

روزِ محشر سے بھی یہ رات زیادہ ہے دراز
سمجھ اے دل نہ تو صبحِ شب فُرقت نزدیک

دور میں چشمِ مست ساقی کے
خُم بدوش قدح بدست ہیں لوگ

عشق کرنا تو کچھ نہیں مشکل،
ہے نباہ اس کا ہم نشیں مشکل

ترے بیمار کو سرِ بستر
یعنی کروٹ ہی مہ جبیں مشکل

حضرتِ دل کیا کرتے ہو شکوہ اس سے آنکھیں دکھانے کا
اُف نہ کرو تقدیر میں جو کچھ دیکھنا ہے سو دیکھو تم!

وہی ہے جانِ جہاں اس جہاں کے پردے میں
کہ کر رہا ہے ستم آسماں کے پردے میں
ظفر زمانے کی نیرنگیوں نے کیا کیا رنگ
دکھائے ہم کو بہار و خزاں کے پردے میں

دل مضمحل ہے کیا اسے خنجر سے چھیڑ دوں
اتنا بھی دم نہیں ہے کہ نشتر سے چھیڑ دوں
بہتر ہزار تذکرے سے ہو وہ اے ظفر
کچھ ذکر شاعری جو سخن در سے چھیڑ دوں

گرد ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں — خاک ہوں خاکسار ہوں کیا ہوں
نہیں معلوم لاغری سے میں — رگِ گل ہوں کہ خار ہوں کیا ہوں
جوں نگیں اتنی سینہ کاوی سے — میں اگر نام دار ہوں کیا ہوں
اتنا ہوں ہوشیار غفلت میں — میں اگر ہوشیار ہوں کیا ہوں
جاں نثاری سے اپنی شاد ظفر
میں جو اس پر نثار ہوں کیا ہوں

میں کہوں کیوں کر کہ شوقِ وصلِ یار اصلا نہیں
کچھ تو ہے جس سے مرے دل کو قرار اصلا نہیں

شکر بارے سرگراں مجھ سے نہیں ہے کوئی یار
میں کسی کی خاطرِ نازک پہ بار اصلا نہیں
اے ظفرؔ تو شوق سے پی ساغرِ صہبائے عشق
اس شرابِ ناب میں رنجِ خمار اصلا نہیں

گُلِ گلزار ہوں تو یاں میں ہوں — اور اگر خار ہوں تو یاں میں ہوں
میرا غم خوار ہے تو دل میرا — دل کا غم خوار ہوں تو یاں میں ہوں
جتنے بدبیں ہیں ان کی آنکھوں میں — اے ظفرؔ خار ہوں تو یاں میں ہوں
کیا عجب مجھ پہ سنگ باری ہو
نخلِ پُر بار ہوں تو یاں میں ہوں

ستم گر دیکھ تو ہم تجھ سے کس اُلفت سے ملتے ہیں
اس اُلفت کے جہاں میں آدمی قسمت سے ملتے ہیں
تصوّر میں کبھی تصویر ان کی دیکھ لیتے ہیں
اب ان سے ہم جو ملتے ہیں تو اس صورت سے ملتے ہیں

گلے کی خو نہیں اپنی وگرنہ تجھ سے تو — شکایتیں ہمیں ظالم نصیب کی سی ہیں
ظفرؔ ڈرا ان سے کہ ہے جنکے شیطنت دلمیں — اور انکی باتیں بظاہر غریب کی سی ہیں

نکل کر خانۂ زنجیر سے دیوانگی ہیں ہم
نہیں ہیں مثلِ آوازِ سلاسل اپنے کہنے میں
خدا جانے کہ ہم دل سوختہ کیا کیا کہیں لیکن
زباں اپنی نہیں جوں شمعِ محفل اپنے کہنے میں

ایک ہو تو کہیئے ہیں دُنیا کے دھندے سیکڑوں
اور ہر دھندے میں ہیں آفت کے پھندے سیکڑوں
ایک ہی اس کے ستم سے اس قدر گھبرا گیا
ایسے ایسے ہوں گے اے دل بعد چندے سیکڑوں
اس کی وہ بندہ نوازی ہے کہ جس سے اے ظفرؔ
ہو گئے اک چیز میں ناچیز بندے سیکڑوں

کسے ناآشنا اور آشنا ہم کس کو کہہ بیٹھیں
بُرا ہم کس کو کہہ بیٹھیں بھلا ہم کس کو کہہ بیٹھیں
کسی کو کیوں کہیں کچھ ہم اگر کہنا ہے کچھ ہم کو
تو قسمت کو کہیں اس کے سوا ہم کس کو کہہ بیٹھیں
نہیں یاں زاہد و مُلّا تو بہتر ہے کہ کچھ مُنہ سے
خدا جانے نشے میں ساقیا ہم کس کو کہہ بیٹھیں

بے راہ نما تنہا جائیں تو کدھر جائیں / معلوم نہیں رستا جائیں تو کدھر جائیں
نے دین کی خواہش ہے نے کفر سے کچھ مطلب / ہم دونوں سے بے پروا جائیں تو کدھر جائیں
رنج و الم و غم نے اندوہ نے حسرت نے / ہے آ کے ہمیں گھیرا جائیں تو کدھر جائیں
صحرائے محبت میں خارِ غمِ فرقت کا / ہے چار طرف کھٹکا جائیں تو کدھر جائیں
دنیا کی ظفرؔ آ کر ہم بھول بھلیوں میں / ہیں بھول گئے رستا جائیں تو کدھر جائیں

حال نہیں کچھ کھلتا میرا کون ہوں کیا ہوں کیسا ہوں
مست ہوں یا ہشیاروں میں ہوں ناداں ہوں یا دانا ہوں
کان سے سب کی سنتا ہوں اور منہ سے کچھ نہیں کہتا ہوں
ہوش بھی ہے بے ہوش بھی ہوں کچھ جاگتا ہوں کچھ سوتا ہوں
کیسا رنج اور کیسی راحت کس کی شادی کس کا غم!
یہ بھی نہیں معلوم مجھے میں جیتا ہوں یا مرتا ہوں
کارِ دیں کچھ بن نہیں آتا دعویٰ ہے دیں داری کا
دنیا سے بیزار ہوں لیکن رکھتا خواہشِ دنیا ہوں
یار ہو میرے دل میں اور میں کعبے میں بت خانے میں
گھر میں وہ موجود ہے اور میں گھر گھر ڈھونڈتا پھرتا ہوں
کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہوں گر دیکھو چشمِ حقیقت سے
میں ہوں ظفرؔ مسجودِ ملائک گرچہ خاک کا پتلا ہوں

ہوئی جس سبب ہم سے تم سے جدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بیاں یہ تو کر دے گی ساری خدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
یہ مشہور ہے دل سے ہے راہ دل کو، کیا کرتا ہے دل ہی آگاہ دل کو
وہ دل ہی سے پوچھو جو ہے دل میں آئی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
ہمیں چاہو تم اور ہم تم کو چاہیں، اِدھر تم نبا ہو اُدھر ہم نباہیں
اس سے رسم و رہ آشنائی، نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
پہیلی سی اک رمز مہر و وفا ہے، اسے پوچھتا ہے تو دل بوجھتا ہے
نہیں جاتی منہ سے یہ ہرگز بتائی، نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بلا سے کوئی گر بھلا یا برا ہو، ہمیں کیا غرض اور تمہیں کام کیا ہے
ظفرؔ اب کسی کی برائی بھلائی، نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

خط و پیغام کی واں بات تو کچھ ہے ہی نہیں
قاصدا امید ملاقات تو کچھ ہے ہی نہیں
ہم خوش اوقات بد اوقات بتائیں کس کو
اپنی اے دوستو اوقات تو کچھ ہے ہی نہیں
ہوتا ہے آپ کے انداز سے مطلب معلوم
ورنہ بندے میں کرامات تو کچھ ہے ہی نہیں
جو کہ منظور اسے ہو وہی ہووے گا ظفرؔ
کیا کروں میں کہ مری بات تو کچھ ہے ہی نہیں

بہے جاتے ہیں دونوں آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر
نہ دل قابو میں اپنے نے جگر ہے اپنے قابو میں !
جو ہووے رہ نوردِ شوق کیا ہو اس سے خودداری
کہ بوئے گُل کہاں وقتِ سفر ہے اپنے قابو میں !

تھے کل جو اپنے گھر میں مہمان وہ کہاں ہیں
جو کھو گئے ہیں یا رب اوسان وہ کہاں ہیں
آنکھوں میں روتے روتے نم بھی نہیں ہے اب تو
تھے موج زن جو پہلے طوفان وہ کہاں ہیں
کچھ اَور ڈھب کے اب تو ہم لوگ دیکھتے ہیں
پہلے جو اے ظفرؔ تھے انسان وہ کہاں ہیں

نالہ و آہِ رسا اپنے ہیں پھر کس کام کے
جب پہونچتا تا بگوشِ دل رُبا کوئی نہیں
آشنا ہیں جتنے ہیں اپنی غرض کے آشنا
خوب دیکھا ہم نے اپنا آشنا کوئی نہیں

جتنی جتنی لوگ جتاتے اپنی یاری مُنہ سے ہیں
اُتنی ان کی خاطرداری ہم بھی کرتے مُنہ سے ہیں

مُنہ کے میٹھے دل کے کڑوے اہلِ دنیا دیکھ لئے
جھوٹی جھوٹی کرتے خوشامد آکے ہماری مُنہ سے ہیں
دل میں بھرے ہیں ان کے لاکھوں بُغض و عداوت کین و نفاق
کرتے ظاہر اپنی اُلفت اور غمخواری مُنہ سے ہیں
کہتے ہیں کچھ کرتے ہیں کچھ ڈرتے رہیئے ان سے ظفرؔ
دُشمنِ جاں ہیں دل سے کرتے ظاہرداری مُنہ سے ہیں

یار نہیں غمخوار نہیں ہمدرد ظفرؔ اب کوئی نہیں
کُنجِ غم میں آپ ہی کہیئے دل کو مرے بہلائے کون

کبھی گھر میں جو آئے تو میرے
میں بھلا شوخ فتنہ گر ہوں کون؟
نہیں کھلتا یہ آج تک مجھ سے
آگیا واں سے میں کدھر ہوں کون؟
بندۂ بادشاہِ مطلق ہوں
گرچہ رکھتا ہوں تاج زر ہوں کون؟
وُہ جو کہتا ہے مجھ کو کون ہے یہ
آتا بے دید کو نظر ہوں کون؟
کوئی پہچانتا بھی ہے مجھ کو
شاہ ہوں یا گدا ظفرؔ ہوں کون؟

زاہد نہ بادہ نوش ہوں نے مے پرست ہوں
رہتا شرابِ عشق ہی سے خوب مست ہوں

یہ نفس کافر اور بھی کرتا ہے سرکشی
ہر روز اس حریف کو دیتا شکست ہوں
ہستی کے میکدے میں ظفرؔ کب ہوا سرور
روزِ ازل سے مستِ شرابِ الست ہوں

ہمیشہ لعل ہی تجھ سے تو چشم تر برستے ہیں
وگرنہ ابر نیساں سے کبھی گوہر برستے ہیں
جنوں رحمت مجھے تیری بدولت دستِ طفلاں سے
جدھر کو ہم نکلتے ہیں ادھر پتھر برستے ہیں

رکھیں گے ہم بھی فلک سے خوشی کی ہر اُمید
کسی کو شاد نہ آسماں دیکھ تو پائیں

مانند نکہتِ گُل عمر اپنی اس چمن میں
کی جس طرح سے ہم نے برباد کچھ نہ پوچھو
احوالِ دل ظفرؔ کا کیا پوچھتے ہو پیارے
کیا جانے شاد ہو یا ناشاد کچھ نہ پوچھو

لکھا نصیب کا ہے کہ لکھوائے اُن سے غیر   جب کچھ کرو کسی کو رقم ہم سے پوچھ لو

ہم جانتے ہیں جس لئے روتے ہو تم ظفرؔ　　یہ ماجرائے دیدۂ نم ہم سے پوچھ لو

کشتۂ قامت جتنے ہیں اس کے آپس میں سب مل جل کر
کر دیں اگر اک حشر بپا کیا اچھا ہو، کیا اچھا ہو
یہ جو پڑا ہے پردۂ غفلت اپنے دیدۂ دل پہ ظفرؔ
کوئی اگر دے اس کو اٹھا کیا اچھا ہو کیا اچھا ہو

کیمیا تقدیر ہی کو اپنی سمجھو اے ظفرؔ
کرتے ہو کیوں جستجو اکسیر کی توبہ کرو

گو تم نے خفا ہو کے نہیں بات کہی کچھ
پر دل میں تمہارے خفگی ہے تو سہی کچھ
جس کے کلۂ فقر ظفرؔ سر پہ ہے زیبا
وہ مال سمجھتا ہی نہیں تاج شہی کچھ

اُن کی اُلفت میں جو خلل آیا
اس خلل میں کچھ اور ہے نقشہ
اے ظفرؔ آپ کی طبیعت کا
ہر غزل میں کچھ اور ہے نقشہ

کچھ ہے اور بیگانہ یگانہ اور کہتا ہے
دل اپنا اور کہتا ہے زمانہ اور کہتا ہے
نکل کر آہ سینے سے مری کچھ اور کہتی ہے
اور آنسو آنکھ سے ہو کر روانہ اور کہتا ہے
یہ ہیں تقدیر کی باتیں کہ میں کچھ اور کہتا ہوں
ہوا وہ سن کے برہم اس نے جانا اور کہتا ہے

پردہ دوئی کا بیچ میں حائل اگر نہ ہو
کیجے جدھر نگاہ وہی پیش نگاہ ہے
کیوں شاہد اپنے حال کی ہم ڈھونڈیں اے ظفر
یہ ہے جو بے کسی یہی اپنی گواہ ہے

کام جو کوشش سے ہو تدبیر اس کا نام ہے
اور بے کوشش جو ہو تقدیر اس کا نام ہے
ہو گئے پتھر مرے نالوں سے پانی اے ظفر
اس کو کہتے ہیں اثر تاثیر اس کا نام ہے

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبے کا
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

غم کو چھوڑوں کیونکہ ہیں گرہ آشنا ہے تو یہی
اب برا ہے تو یہی ہے اور بھلا ہے تو یہی
میں نے اس قاتل سے پوچھا آج کیا دل میں ترے
قتل کا میرے ارادہ ہے۔ کہا ہے تو یہی

ہمیں مستی سی ہے صہبا کی رہتی — نہیں بالکل خبر دُنیا کی رہتی
نہ پوچھا ماجرا اشکوں کا میرے — روانی سی ہی اک دریا کی رہتی
تڑپتا ہے مثالِ مُرغِ بسمل — یہ حالت ہے دل شیدا کی رہتی

شوقِ پا بوسی میں ہم دور سے دوڑے آئے
چومنے کو یہ قدم دور سے دوڑے آئے
صید افگن جو ہوا وہ صنم کافر کیش!
سیکڑوں صیدِ حرم دور سے دوڑے آئے
جب رہا پاس ظفرؔ کوئی نہ اپنے غم خوار
سُنتے ہی حضرتِ غم دور سے دوڑے آئے

نے طلب ہے دیں کی ہم کو نے ہیں دنیا ڈھونڈتے
ہم خدا جانے ہیں طالب کس کے اور کیا ڈھونڈتے
جو تماشا دیکھ کر محوِ تماشا ہم ہوئے
کیا تماشا ہے وہی ہیں ہم تماشا ڈھونڈتے

جان میری تن میں اے قاتل تڑپتی چھوڑ دی
اور اک تو نے نہ کیوں تیغ دو دستی چھوڑ دی
خود پرستی بُت پرستی سے نہیں کم اے ظفر
جس نے چھوڑی خود پرستی بُت پرستی چھوڑ دی

یہ نقشہ ہو گیا ہے میرا سودائے محبت میں
مری صورت مرے یاروں سے پہچانی نہیں جاتی
طبیعت ہے جواں پیری میں بھی وہ اے ظفر تیری
سخن فہمی، سخن سنجی، سخن دانی نہیں جاتی

تپِ غم سے جب اپنا دیدۂ تر سوکھ جاتا ہے
تو بے آبی سے دریا کیا سمندر سوکھ جاتا ہے
کہوں کیا تشنہ کامی اپنی آتے آتے ہی لب تک
شرابِ ناب کا لبریز ساغر سوکھ جاتا ہے

ہم نے دیکھے عجب اس بحرِ جہاں کے دھوکے
دے ہے یاں ریگِ رواں آبِ رواں کے دھوکے
سچ ہے دنیا کو اگر دھوکے کی ٹٹی کہیے!
اے ظفر کھلتے کسی پر نہیں یاں کے دھوکے

کرتا پیدا عالم آرا عالم ہیں سے عالم ہے،
عالم کو دکھلاتا اپنا عالم ہیں سے عالم ہے
کِس کِس کا افسوس کریں آگے سے ان آنکھوں کے
اُٹھ گیا اے دل دیکھا کیا کیا عالم ہیں سے عالم ہے
آتے عادم سے ہستی ہیں ہستی سے عادم کو جاتے ہیں
رکھتا کیا ہی سیہ دھار ستا عالم ہیں سے عالم ہے
ہر دم ایک نیا ہی عالم دیکھتے ہیں عالم ہیں ہم
دیکھ ظفر کیا پیدا ہوتا عالم ہیں سے عالم ہے

صبح رو رو کے شام ہوتی ہے
شب تڑپ کر تمام ہوتی ہے
سامنے چشم مست کے ساقی
کس کو پروائے جام ہوتی ہے
کوئی غنچہ کھِلا کہ بُلبُل کو
بیکلی زیر دام ہوتی ہے،
ہم جو کہتے ہیں کچھ اِشاروں سے
یہ خطا لا کلام ہوتی ہے،

دوست اپنے ہوئے ظفر دشمن　　اس مصیبت کو کون پہچانے

خواب تھی جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی
ورنہ اپنی عمر ساری درد و غم میں کٹ گئی

بول اُٹھا تیرے آگے جو غنچہ پٹاق سے
مارا صبا نے منہ پر تمانچہ تڑاق سے
صحبت منافقانہ ہے ہر جا نفاق سے
کچھ اتفاق ہے تو کہیں اتفاق سے
دیکھا نہ تجھ کو ہم یونہی محروم ہی چلے
آئے تھے تیری دید کو کس اشتیاق سے

وصلِ جاناں میں جو تھے عشرت کے وہ دن ٹل گئے
آ گئے دن رنج کے راحت کے وہ دن ٹل گئے
ضعف پیری کا بُرا ہو کھو دیا سب کار سے
اب رہی طاقت کہاں طاقت کے وہ دن ٹل گئے
اب تو خونِ دل ہی ہم پیتے ہیں حسرت میں مُدام
بادۂ عیش و مئے عشرت کے وہ دن ٹل گئے
اب تو بیزاری ہے ساقی دخترِ رز سے ہمیں
اس سے رغبت کیا کریں رغبت کے وہ دن ٹل گئے

عہدِ پیری میں کہاں جوشِ جوانی کی اُمنگ
اے ظفرؔ افسوس کیفیت کے وہ دن ٹل گئے

انھیں کے ہے دل میں بہت اُس سے اُلفت
جو کہتے ہیں دُنیا کو مُردار مُنہ سے
محبت میں گو لاکھ صدمے ہوں دل پر
ظفرؔ کچھ نہ نکلے خبردار مُنہ سے

ہم نے فقط نہ جلوہ نمائی کی سیر کی
روئے صنم میں ساری خدائی کی سیر کی
کب دیکھتا ہے سلطنتِ جم کو آنکھ سے
ہو جس بشر نے کوئے گدائی کی سیر کی!

میرے نزدیک ظفرؔ بادہ پرستی اچھّی
پر نہیں ہے مئے پندار کی مستی اچھّی
ہے جنہیں ہوش ظفرؔ رہتے ہیں دنیا سے الگ
کہ نہیں اُلفتِ مے خانہ ہستی اچھّی

سن ستاون میری نظر میں

ناصر کاظمی ــــ انتظار حسین

۱۸۵۷ء سے ہمارا خون کیوں گرم ہونے لگتا ہے۔ آج سے سو برس ادھر بھی تو یاروں کو اس جنون خیز برس کی یاد اسی طرح آئی تھی اور جون میں جنگ پلاسی کی یادگار منانے کی تیاریاں کی تھیں۔

یہ کس شہید کی روح ہے کہ ستاون کے ستاون ہمیں پکارتی ہے۔ للکارتی ہے۔ ہم اس للکار کو کب سنیں گے؟

تمام واقعات دلچسپ اور مؤثر انداز میں۔

قیمت چھ روپے

آئینۂ ادب ☆ چوک مینار انار کلی لاہور

سرورق رہن پریس، لاہور میں چھپا